جادوگروں کا عجیب وغریب منظر

جب جادوگروں نے فرعون کے ساتھ اپنی بات پکی کرلی اور اس نے بھی انعام، اجرت اور اپنی بارگاہ کے مقرب ہونے کا وعدہ کرکے انہیں خوش کردیا اور وہ بھی مطمئن ہوگئے تو اپنے فن کے مظاہرے اور اس کے اسباب کی فراہمی کے لئے تگ ودو کرنی شروع کردی، فرصت کے ان لمحات میں انھوں نے بہت سی رسیاں اور لاٹھیاں اکٹھی کرلیں اور بظاہر ان کے اندر کو کھوکھلا کرکے ان میں ایسا کوئی کیمیکل مواد (پارہ وغیرہ کی مانند) بھر دیا جس سے وہ سورج کی تپش میں ہلکی ہوکر بھاگنے لگتی۔

آخر کار وعدے کا دن پہنچ گیا اور لوگوں کا کثیر مجمع میدان میں جمع ہوگیا تاکہ وہ اس تاریخی مقابلے کو دیکھ سکیں، فرعون اور اس کے درباری، جادوگر اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام سب میدان میں پہنچ گئے۔

لیکن حسب معمول قرآن مجید اس بحث کو حذف کرکے اصل بات کو بیان کرتا ہے۔

یہاں پر بھی اس تاریخ ساز منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے: ''موسیٰ نے جادوگروں کی طرف منہ کرکے کہا: جو کچھ پھینکنا چاہتے ہو پھینکو اور جو کچھ تمہارے پاس ہے میدان میں لے آؤ''۔ [1]

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے یہ بات اس وقت کی جب جادوگروں نے ان سے کہا: ''آپ پیش قدم ہوکر اپنی چیز ڈالیں گے یا ہم؟'' [2]

موسیٰ علیہ السلام کی یہ پیش کش درحقیقت انہیں اپنی کامیابی پر یقین کی وجہ سے تھی اور اس بات کی مظہر تھی کہ فرعون کے زبردست حامیوں اور دشمن کے انبوہ کثیر سے وہ ذرہ برابر بھی خائف نہیں، چنانچہ یہ پیش کش کرکے آپ نے جادوگروں پر سب سے پہلا کامیاب وار کیا جس سے جادوگروں کو بھی معلوم ہوگیا کہ موسیٰ علیہ السلام ایک خاص نفسیاتی سکون سے بہرہ مند ہیں اور وہ کسی ذات خاص سے لو لگائے ہوئے ہیں کہ جو ان کا حوصلہ بڑھا رہی ہے۔

جادوگر تو غرور ونخوت کے سمندر میں غرق تھے انھوں نے اپنی انتہائی کوششیں اس کام کے لئے صرف کردی تھیں اور انھیں اپنی کامیابی کا بھی یقین تھا ''لہٰذا انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینک دیں اور کہا فرعون کی عزت کی قسم ہم یقیناً کامیاب ہیں''۔ [3]

جی ہاں: انھوں نے دوسرے تمام چاپلوسیوں خوشامدیوں کی مانند فرعون کے نام سے شروع کیا اور اس کے کھوکھلے اقتدار کا سہارا لیا۔

جیسا کہ قرآن مجید ایک اور مقام پر کہتا ہے: ''اس موقع پر انھوں نے جب رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینکیں تو وہ چھوٹے بڑے سانپوں کی طرح زمین پر حرکت کرنے لگیں''۔ [4]

انھوں نے اپنے جادو کے ذرائع میں سے لاٹھیوں کا انتخاب کیا ہوا تھا تاکہ وہ بزعم خود موسیٰ کی عصا کی برابری کرسکیں اور مزید برتری کے لئے رسیوں کو بھی ساتھ شامل کرلیا تھا۔

---

[1] سورہ شعراء آیت 43

[2] سورہ اعراف آیت 115

[3] سورہ شعراء آیت 44

[4] سورہ طٰہٰ آیت 66

اسی دوران میں حاضرین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور فرعون اور اس کے درباریوں کی آنکھیں خوشی کے مارے چمک اٹھیں اور وہ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے تھے یہ منظر دیکھ کر ان کے اندر وجد و سرور کی کیفیت پیدا ہوگئی اور وہ جھوم رہے تھے۔ چنانچہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق ان ساحروں کی تعداد کئی ہزار تھی نیز ان کے وسائل سحر بھی ہزاروں کی تعداد میں تھے چونکہ اس زمانے میں مصر میں سحر و ساحری کا کافی زور تھا اس بنا پر اس بات پر کوئی جائے تعجب نہیں ہے۔

خصوصاً جیسا کہ قرآن [1] کہتا ہے کہ: وہ منظر اتنا عظیم و وحشت ناک تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس کی وجہ سے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا۔

اگر چہ نہج البلاغہ میں اس کی صراحت موجود ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس بات کا خوف لاحق ہو گیا تھا کہ ان جادوگروں کو دیکھ کر لوگ اس قدر متاثر نہ ہو جائیں کہ ان کو حق کی طرف متوجہ کرنا دشوار ہو جائے بہر صورت یہ تمام باتیں اس بات کی مظہر ہیں کہ اس وقت ایک عظیم معرکہ درپیش تھا جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بفضل الٰہی سر کرنا تھا۔

جادوگروں کے دل میں ایمان کی چمک لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اس کیفیت کو زیادہ دیر نہیں پنپنے دیا وہ آگے بڑھے اور اپنے عصا کو زمین پر دے مارا تو وہ اچانک ایک اژدھے کی شکل میں بتدیل ہو کر جادوگروں کے ان کرشموں کو جلدی نگلنے لگا اور انہیں ایک ایک کر کے کھا گیا۔ [2]

کیا عصا کا اژدھا بن جانا ممکن ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ عصا کا اژدھا بن جانا ایک بیّن معجزہ ہے جس کی توجیہ مادی اصول سے نہیں کی جا سکتی، بلکہ ایک خدا پرست شخص کو اس سے کوئی تعجب بھی نہ ہوگا کیونکہ وہ خدا کو قادر مطلق اور سارے عالم کے قوانین کو ارادہ الٰہی کے تابع سمجھتا ہے لہٰذا اس کے نزدیک یہ کوئی بڑی بات نہیں کہ لکڑی کا ایک ٹکڑا حیوان کی صورت اختیار کر لے کیونکہ ایک مافوق طبیعت قدرت کے زیر اثر ایسا ہونا عین ممکن ہے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی نہ بھولنا چاہئے کہ اس جہان طبیعت میں تمام حیوانات کی خلقت خاک سے ہوئی ہے نیز لکڑی و نباتات کی خلقت بھی خاک سے ہوئی ہے لیکن مٹی سے ایک بڑا سانپ بننے کے لئے عادتاً شاید کروڑوں سال کی مدت درکار ہے، لیکن اعجاز کے ذریعے یہ طولانی مدت اس قدر کوتاہ ہوگئی کہ وہ تمام انقلابات ایک لحظہ میں طے ہو گئے جن کی بنا پر مٹی سے سانپ بنتا ہے، جس کی وجہ سے لکڑی کا ایک ٹکڑا جو قوانین طبیعت کے زیر اثر ایک طولانی مدت میں سانپ بنتا، چند لحظوں میں یہ شکل اختیار کر گیا۔

اس مقام پر کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو تمام معجزات انبیاء کی طبیعی اور مادی توجیہات کرتے ہیں جس سے ان کے اعجازی پہلوؤں کی نفی ہوتی ہے، اور ان کی یہ سعی ہوتی ہے کہ تمام معجزات کو معمول کے مسائل کی شکل میں ظاہر کریں، ہر چند وہ کتب آسمانی کی نص اور الفاظ صریحہ کے خلاف ہو، ایسے لوگوں سے ہمارا یہ سوال ہے کہ وہ اپنی پوزیشن اچھی طرح سے واضح کریں۔ کیا وہ واقعاً خدا کی عظیم قدرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اسے قوانین طبیعت پر حاکم مانتے ہیں کہ نہیں؟ اگر وہ خدا کو قادر و توانا نہیں سمجھتے تو ان سے انبیاء کے حالات اور ان کے معجزات کی بات کرنا بالکل بے کار ہے اور اگر وہ خدا کو قادر جانتے ہیں تو پھر ذرا تامل کریں کہ ان تکلف آمیز توجیہوں

---

[1] سورہ طٰہٰ آیت 67

[2] سورہ طٰہٰ آیت 66

کی کیا ضرورت ہے جو سراسر آیات قرآنی کے خلاف ہیں (اگر چہ زیر بحث آیت میں میری نظر سے نہیں گزرا کہ کسی مفسر نے جس کا طریقہ تفسیر کیسا ہی مختلف کیوں نہ ہو اس آیت کی مادی توجیہہ کی ہو، تاہم جو کچھ ہم نے بیان کیا وہ ایک قاعدہ کلی کے طور پر تھا۔

اس موقع پر لوگوں پر یکدم سکوت طاری ہوگیا حاضرین پر سناٹا چھا گیا، تعجب کی وجہ سے ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے آنکھیں پتھرا گئی گویا ان میں جان ہی نہیں رہی لیکن بہت جلد تعجب کے بجائے وحشت ناک چیخ و پکار شروع ہوگئی، کچھ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے کچھ لوگ نتیجے کے انتظار میں رک گئے اور کچھ لوگ بے مقصد نعرے لگا رہے تھے لیکن جادوگروں کے منہ تعجب کی وجہ سے کھلے ہوئے تھے۔

اس مرحلے پر سب کچھ تبدیل ہوگیا جو جادوگر اس وقت تک شیطانی رستے پر گامزن، فرعون کے ہم رکاب اور موسیٰ علیہ السلام کے مخالف تھے یک دم اپنے آپے میں آگئے اور کیونکہ جادو کے ہر قسم کے ٹونے ٹوٹکے اور مہارت اور فن سے واقف تھے اس لئے انہیں یقین آ گیا کہ ایسا کام ہرگز جادو نہیں ہوسکتا، بلکہ یہ خدا کا ایک عظیم معجزہ ہے ''لہٰذا اچانک وہ سارے کے سارے سجدے میں گر پڑے''۔[1]

دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن نے یہاں پر ''القی'' کا استعمال کیا ہے جس کا معنی ہے گرا دیئے گئے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے معجزے سے اس قدر متاثر ہو چکے تھے کہ بے اختیار زمین پر سجدے میں جا پڑے۔

اس عمل کے ساتھ ساتھ جو ان کے ایمان کی روشن دلیل تھا؛ انھوں نے زبان سے بھی کہا: ''ہم عالمین کے پروردگار پر ایمان لے آئے''۔[2]

اور ہر قسم کا ابہام و شک دور کرنے کے لئے انھوں نے ایک اور جملے کا بھی اضافہ کیا تا کہ فرعون کے لئے کسی قسم کی تاویل باقی نہ رہے، انھوں نے کہا: ''موسیٰ اور ہارون کے رب پر''۔[3]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عصا زمین پر مارنے اور ساحرین کے ساتھ گفتگو کرنے کا کام اگر چہ موسیٰ علیہ السلام نے انجام دیا لیکن ان کے بھائی ہارون علیہ السلام ان کے ساتھ ساتھ ان کی حمایت اور مدد کر رہے تھے۔

یہ عجیب و غریب تبدیلی جادوگروں کے دل میں پیدا ہوگئی اور انھوں نے ایک مختصر سے عرصے میں مطلق تاریکی سے نکل کر روشنی اور نور میں قدم رکھ دیا اور جن جن مفادات کا فرعون نے ان سے وعدہ کیا تھا ان سب کو ٹھکرا دیا، یہ بات تو آسان تھی، انھوں نے اس اقدام سے اپنی جانوں کو بھی خطرے میں ڈال دیا، یہ صرف اس وجہ سے تھا کہ ان کے پاس علم و دانش تھا جس کے باعث وہ حق اور باطل میں تمیز کرنے میں کامیاب ہوگئے اور حق کا دامن تھام لیا۔

کیا میری اجازت کے بغیر موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے؟

اس موقع پر اس طرف تو فرعون کے اوسان خطا ہو چکے تھے اور دوسرے اسے اپنا اقتدار بلکہ اپنا وجود خطرے میں دکھائی دے رہا تھا خاص طور پر وہ جانتا تھا کہ جادوگروں کا ایمان لانا حاضرین کے دلوں پر کس قدر موثر ہوسکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کافی سارے لوگ جادوگروں کی دیکھا دیکھی سجدے میں گر جائیں، لہٰذا اس نے بزعم خود ایک نئی اسکیم نکالی اور جادوگروں کی طرف منہ کر کے

---

[1] سورہ شعراء آیت 46

[2] سورہ شعراء آیت 47

[3] سورہ شعراء آیت 48

کہا: ''تم میری اجازت کے بغیر ہی اس پر ایمان لے آئے ہو''۔[1]

چونکہ وہ سالہا سال سے تخت استبداد پر براجمان چلا آ رہا تھا لہٰذا اسے قطعاً یہ امید نہیں تھی کہ لوگ اس کی اجازت کے بغیر کوئی کام انجام دیں گے بلکہ اسے تو یہ توقع تھی کہ لوگوں کے قلب و عقل اور اختیار اس کے قبضہ قدرت میں ہیں، جب تک وہ اجازت نہ دے وہ نہ تو کچھ سوچ سکتے ہیں اور نہ فیصلہ کر سکتے ہیں، جابر حکمرانوں کے طریقے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔

لیکن اس نے اسی بات کو کافی نہیں سمجھا بلکہ دو جملے اور بھی کہے تا کہ اپنے زعم باطل میں اپنی حیثیت اور شخصیت کو برقرار رکھ سکے اور ساتھ ہی عوام کے بیدار شدہ افکار کے آگے بند باندھ سکے اور انہیں دوبارہ خواب غفلت میں سلا دے۔

اس نے سب سے پہلے جادوگروں سے کہا: ''تمہاری موسیٰ سے یہ پہلے سے لگی بندھی سازش ہے، بلکہ مصری عوام کے خلاف ایک خطرناک منصوبہ ہے اس نے کہا کہ وہ تمہارا بزرگ اور استاد ہے جس نے تمہیں جادو کی تعلیم دی ہے اور تم سب نے جادوگری کی تعلیم اسی سے حاصل کی ہے۔''[2]

تم نے پہلے سے طے شدہ منصوبہ کے تحت یہ ڈرامہ رچایا ہے تا کہ مصر کی عظیم قوم کو گمراہ کر کے اس پر اپنی حکومت چلاؤ اور اس ملک کے اصلی مالکوں کو ان کے گھروں سے بے گھر کر دو اور ان کی جگہ غلاموں اور کنیزوں کو ٹھہراؤ۔

لیکن میں تمہیں کبھی اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم اپنی سازش میں کامیاب ہو جاؤ، میں اس سازش کو پنپنے سے پہلے ہی ناکام کر دوں گا ''تم بہت جلد جان لو گے کہ تمہیں ایسی سزا دوں گا جس سے دوسرے لوگ عبرت حاصل کریں گے تمہارے ہاتھ اور پاؤں کو ایک دوسرے کی مخالف سمت میں کاٹ ڈالوں گا (دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں، یا بایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں) اور تم سب کو (کسی استثناء کے بغیر) سولی پر لٹکا دوں گا''۔[3]

یعنی صرف یہی نہیں کہ تم سب کو قتل کر دوں گا بلکہ ایسا قتل کروں گا کہ جس میں دکھ، درد، تکلیف اور شکنجہ بھی ہوگا اور وہ بھی سرعام کھجور کے بلند درختوں پر کیونکہ ہاتھ پاؤں کے مخالف سمت کے کاٹنے سے احتمالاً انسان کی دیر سے موت واقع ہوتی ہے اور وہ تڑپ تڑپ کر جان دیتا ہے۔

ہمیں اپنے محبوب کی طرف پلٹا دے

لیکن فرعون یہاں پر سخت غلط فہمی میں مبتلا تھا کیونکہ کچھ دیر قبل کے جادوگر اور اس وقت کے مومن افراد نور ایمان سے اس قدر منور ہو چکے تھے اور خدائی عشق کی آگ ان کے دل میں اس قدر بھڑک چکی تھی کہ انھوں نے فرعون کی دھمکیوں کو ہرگز ہرگز کوئی وقعت نہ دی بلکہ بھرے مجمع میں اسے دوٹوک جواب دے کر اس کے تمام شیطانی منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔

انھوں نے کہا: ''کوئی بڑی بات نہیں اس سے ہمیں ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو، ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جائیں گے''۔[4]

اس کام سے نہ صرف یہ کہ تم ہمارا کچھ بگاڑ نہ سکو گے بلکہ ہمیں اپنے حقیقی معشوق اور معبود تک بھی پہنچا دو گے، تمہاری یہ

---

[1] سورہ شعراء آیت 49
[2] سورہ شعراء آیت 49
[3] سورہ شعراء آیت 49
[4] سورہ شعراء آیت 49

دھمکیاں ہمارے لئے اس وقت مؤثر تھیں جب ہم نے خود کو نہیں پہچانا تھا، اپنے خدا سے نا آشنا تھے اور راہ حق کو بھلا کے زندگی کے بیابان میں سرگردان تھے لیکن آج ہم نے اپنی گمشدہ گراں بہا چیز کو پالیا ہے جو کرنا چاہو کرلو۔

انھوں نے سلسلہ کلام آگے بڑھاتے ہوئے کہا: ہم ماضی میں گناہوں کا ارتکاب کر چکے ہیں اور اس میدان میں بھی اللہ کے سچے رسول جناب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مقابلے میں پیش پیش تھے اور حق کے ساتھ لڑنے میں ہم پیش قدم تھے لیکن ''ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہمارے گناہ معاف کردے گا کیونکہ ہم سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں''۔[1]

ہم آج کسی چیز سے نہیں گھبراتے، نہ تو تمہاری دھمکیوں سے اور نہ ہی بلند و بالا کھجور کے درختوں کے تنوں پر سولی پر لٹک جانے کے بعد ہاتھ پاؤں مارنے سے۔

اگر ہمیں خوف ہے تو اپنے گزشتہ گناہوں کا اور امید ہے کہ وہ بھی ایمان کے سائے اور حق تعالیٰ کی مہربانی سے معاف ہوجائیں گے۔

یہ کیسی طاقت ہے کہ جب کسی انسان کے دل میں پیدا ہوجاتی ہے تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کی نگاہوں میں حقیر ہوجاتی ہے اور وہ سخت سے سخت شکنجوں سے بھی نہیں گھبراتا اور اپنی جان دے دینا اس کے لئے کوئی بات ہی نہیں رہتی۔ یقیناً یہ ایمانی طاقت ہوتی ہے۔

یہ عشق کے روشن و درخشاں چراغ کا شعلہ ہوتا ہے جو شہادت کے شربت کو انسان کے حلق میں شہد سے بھی زیادہ شیریں بنادیتا ہے اور محبوب کے وصال کو انسان کا ارفع و اعلیٰ مقصد بنادیتا ہے۔

بہر حال یہ منظر فرعون اور اس کے ارکان سلطنت کے لئے بہت ہی مہنگا ثابت ہوا ہر چند کہ بعض روایات کے مطابق اس نے اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ بھی پہنایا اور تازہ ایمان لانے والے جادوگروں کو شہید کردیا لیکن عوام کے جو جذبات موسیٰ علیہ السلام کے حق میں اور فرعون کے خلاف بھڑک اٹھے تھے وہ انہیں نہ صرف دبا نہ سکا بلکہ اور بھی برانگیختہ کردیا۔

اب جگہ جگہ اس خدائی پیغمبر کے تذکرے ہونے لگے اور ہر جگہ ان با ایمان شہداء کے چرچے تھے بہت سے لوگ اس وجہ سے ایمان لے آئے۔ جن میں فرعون کے کچھ نزدیکی لوگ بھی تھے حتیٰ کہ خود اس کی زوجہ ان ایمان لانے والوں میں شامل ہوگئی۔

فرعون کی زوجہ ایمان لے آئی

فرعون کی بیوی کا نام آسیہ اور باپ کا نام مزاحم تھا۔ کہتے ہیں کہ جب اس نے جادوگروں کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کو دیکھا تو اس کے دل کی گہرائیاں نور ایمان سے روشن ہوگئیں، وہ اسی وقت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئی۔ وہ ہمیشہ اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھتی تھی۔ لیکن ایمان اور خدا کا عشق ایسی چیز نہیں ہے جسے ہمیشہ چھپایا جاسکے۔ جب فرعون کو اس کے ایمان کی خبر ہوئی تو اس نے اسے بارہا سمجھایا اور منع کیا اور یہ اصرار کیا کہ موسیٰ کے دین سے دستبردار ہوجائے اور اس کے خدا کو چھوڑ دے، لیکن یہ با استقامت خاتون فرعون کی خواہش کے سامنے ہرگز نہ جھکی۔

آخر کار فرعون نے حکم دیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں میخوں کے ساتھ جکڑ کر اسے سورج کی جلتی ہوئی دھوپ میں ڈال دیا جائے اور ایک بہت بڑا پتھر اس کے سینہ پر رکھ دیں۔ جب وہ خاتون اپنی زندگی کے آخری لمحے گزار رہی تھی تو اس کی دعا یہ تھی:

---

[1] سورہ شعراء آیت 51

''پروردگارا میرے لئے جنت میں اپنے جوار رحمت میں ایک گھر بنادے۔ مجھے فرعون اور اس کے عمال سے رہائی بخش اور مجھے اس ظالم قوم سے نجات دے''۔

خدا نے بھی اس پاکباز اور فدار کار مومنہ خاتون کی دعا قبول کی اور اسے مریم سلام اللہ علیہا جیسی دنیا کی بہترین خاتون جناب مریم سلام اللہ علیہا کے ہم ردیف قرار پائی ہے۔

ایک روایت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

''اہل جنت میں افضل ترین اور برترین عورتیں چار ہیں۔خویلد کی بیٹی خدیجہ سلام اللہ علیہا، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی فاطمہ علیہا السلام اور عمران کی بیٹی مریم سلام اللہ علیہا اور مزاحم کی بیٹی آسیہ علیہا السلام جو فرعون کی بیوی تھی''۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ فرعون کی بیوی اپنی اس بات سے فرعون کے عظیم قصر کی تحقیر کر رہی ہے، اور اسے خدا کے جوار رحمت میں گھر کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں دیتی۔اس گفتگو کے ذریعہ ان لوگوں کے جواسے یہ نصیحت کرتے تھے کہ ان تمام نمایاں وسائل وامکانات کو جو ملکہ مصر ہونے کی وجہ سے تیرے قبضہ واختیار میں ہیں، موسیٰ علیہ السلام جیسے چرواہے پر ایمان لاکر ہاتھ سے نہ دے۔ جواب دیتی ہے:

اور ''نجی من فرعون و عمله'' کے جملہ کے ساتھ خود فرعون سے اور اس کے مظالم اور جرائم سے بیزاری کا اعلان کرتی ہے۔

اور ''نجی من القوم الظالمین'' کے جملہ سے اس آلودہ ماحول سے اپنی علیحدگی، اور ان کے جرائم سے اپنی بیگانگی کا اظہار کرتی ہے۔

مسلمہ طور پر فرعون کے دربار سے بڑھ کر زرق برق اور جلال وجبروت موجود نہیں تھا۔اسی طرح فرعون جیسے جابر وظالم کے شکنجوں سے بڑھ کر فشار اور شکنجے موجود نہیں تھے۔لیکن نہ تو وہ زرق برق اور نہ ہی وہ فشار اور شکنجے اس مومنہ عورت کے گھٹنے جھکا سکے۔ اس نے رضائے خدا میں اپنا سفر اسی طرح سے جاری رکھا۔ یہاں تک کہ اپنی عزیز جان اپنے حقیقی محبوب کی راہ میں فدا کر دی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ وہ یہ استدعا کرتی ہے کہ اے خدا جنت میں اور اپنے جوار میں اس کے لئے ایک گھر بنادے جس کا جنت میں ہونا تو جنبہ جسمانی ہے اور خدا کے جوار رحمت میں ہونا جنبہ روحانی ہے۔اس نے ان دونوں کو ایک مختصر سی عبارت میں جمع کر دیا ہے۔

جناب موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا حکم

ایک طرف موسیٰ علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں کے درمیان باہمی نزاع، اور دوسری طرف فرعون اور اس کے ہم نواؤں کے ساتھ لڑائی جھگڑا کافی حد تک بڑھ گیا اور اس دوران میں بہت سے واقعات رونما ہو چکے، جنہیں قرآن نے اس مقام پر ذکر نہیں کیا بلکہ ایک خاص مقصد کو جسے ہم بعد میں بیان کریں گے پیش نظر رکھ کر ایک نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ حالات بہت خراب ہو گئے تو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام علیہ السلام کی انقلابی تحریک کو دبانے بلکہ ختم کرنے کے لئے ان کے قتل کی ٹھان لی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کے مشیروں اور درباریوں نے اس کے اس فیصلے کی مخالفت کی۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

''فرعون نے کہا مجھے چھوڑ دو تاکہ میں موسیٰ کو قتل کر ڈالوں اور وہ اپنے پروردگار کو بلائے تاکہ وہ اسے اس سے نجات دے''۔

[1]

اس سے یہ بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ اس کے اکثر یا کم از کم کچھ مشیر موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے مخالف تھے وہ یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ چونکہ موسیٰ کے کام معجزانہ اور غیر معمولی ہیں لہٰذا ہوسکتا ہے کہ وہ ہمارے لئے بددعا کردے تو اس کا خدا ہم پر عذاب نازل کردے لیکن کبر وغرور کے نشے میں مست فرعون کہنے لگا: میں تو اسے ضرور قتل کروں گا جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

یہ بات تو معلوم نہیں ہے کہ فرعون کے حاشیہ نشینوں اور مشیروں نے کس بناء پر اسے موسیٰ علیہ السلام کے قتل سے باز رکھا البتہ یہاں پر چند ایک احتمال ضرور ہیں اور ہوسکتا ہے وہ سب کے سب صحیح ہوں۔

ایک احتمال تو یہ ہے کہ ممکن ہے خدا کی طرف سے عذاب نازل ہوجائے۔

دوسرا احتمال ان کی نظر میں یہ ہوسکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے مارے جانے کے بعد حالات یکسر دگرگوں ہوجائیں گے کیونکہ وہ ایک شہید کا مقام پالیں گے اور انہیں ہیرو کا درجہ مل جائے گا اس طرح سے ان کا دین بہت سے مومن، ہمنوا، طرفدار اور ہمدرد پیدا کرلے گا۔

خلاصہ کلام انہیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ بذات خود موسیٰ ان کے لئے ایک عظیم خطرہ ہیں لیکن اگر ان حالات میں انہیں قتل کردیا جائے تو یہ حادثہ ایک تحریک میں بدل جائے گا جس پر کنٹرول کرنا بھی مشکل ہوجائے گا اور اس سے جان چھڑانی مشکل تر ہوجائے گی۔

فرعون کے کچھ درباری ایسے بھی تھے جو قلبی طور پر فرعون سے راضی نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام زندہ رہیں اور فرعون کی تمام تر توجہ انہی کی طرف مبذول رہے، اس طرح سے وہ چار دن آرام کے ساتھ بسر کرلیں اور فرعون کی آنکھوں سے اوجھل رہ کر ناجائز مفاد اٹھاتے رہیں کیونکہ یہ ایک پرانا طریقہ کار ہے کہ بادشاہوں کے درباری اس بات کی فکر میں رہتے ہیں کہ ہمیشہ ان کی توجہ دوسرے امور کی طرف مبذول رہے تاکہ وہ آسودہ خاطر ہوکر اپنے ناجائز مفادات کی تکمیل میں لگے رہیں۔ اسی لئے تو بعض اوقات وہ بیرونی دشمن کو بھی بھڑکاتے ہیں تاکہ بادشاہ کی فارغ البالی کے شر سے محفوظ رہیں۔

کہیں موسیٰ تمہارا مذہب نہ بدل دے

بہرحال فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کے منصوبے کی توجیہہ کرتے ہوئے اپنے درباریوں کے سامنے اس کی دو دلیلیں بیان کیں۔ ایک کا تعلق دینی اور روحانی پہلو سے تھا اور دوسری کا دنیاوی اور مادی سے، وہ کہنے لگا: مجھے اس بات کا خوف ہے کہ وہ تمہارے دین کو تبدیل کردے گا اور تمہارے باپ دادا کے دین کو دگرگوں کردے گا، یا یہ کہ زمین میں فساد اور خرابی برپا کردے گا۔ [2]

اگر میں خاموشی اختیار کرلوں تو موسیٰ بہت جلد مصر والوں میں اتر جائے گا اور بت پرستی کا ''مقدس دین'' جو تمہاری قومیت اور مفادات کا محافظ ہے ختم ہوجائے گا اور اس کی جگہ توحید پرستی کا دین لے لے گا جو یقیناً تمہارے سو فیصد خلاف ہوگا۔

اگر میں آج خاموش ہوجاؤں اور کچھ عرصہ بعد موسیٰ سے مقابلہ کرنے کے لئے اقدام کروں تو اس دوران میں وہ اپنے بہت سے دوست اور ہمدرد پیدا کرلے گا جس کی وجہ سے زبردست لڑائی چھڑ جائے گی جو ملکی سطح پر خونریزی، گڑبڑ اور بے چینی کا سبب بن

---

[1] سورہ مومن آیت 26

[2] سورہ مومن آیت 26

جائے گی اسی لئے مصلحت اسی میں ہے کہ جتنا جلدی ہو سکے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس گفتگو سے موسیٰ علیہ السلام نے کس ردعمل کا اظہار کیا جو اس مجلس میں تشریف فرما بھی تھے، قرآن کہتا ہے: موسیٰ نے کہا: ''میں اپنے پروردگار اور تمہارے پروردگار کی ہر اس متکبر سے پناہ مانگتا ہوں جو روز حساب پر ایمان نہیں لاتا''۔ [1]

موسیٰ علیہ السلام نے یہ باتیں بڑے سکون قلب اور اطمینان خاطر سے کیں جو ان کے قوی ایمان اور ذات کردگار پر کامل بھروسے کی دلیل ہیں اور اس طرح سے ثابت کر دیا کہ اس کی اس دھمکی سے وہ ذرہ بھر بھی نہیں گھبرائے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس گفتگو سے ثابت ہوتا ہے کہ جن لوگوں میں مندرجہ ذیل دو صفات پائی جائیں وہ نہایت ہی خطرناک افراد ہیں ایک ''تکبر'' اور دوسرے ''قیامت پر ایمان نہ رکھنا'' اور اس قسم کے افراد سے خدا کی پناہ مانگنی چاہئے۔

آیا کسی کو خدا کی طرف بلانے پر بھی قتل کرتے ہیں؟

یہاں سے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی تاریخ کا ایک اور اہم کردار شروع ہوتا ہے اور وہ ہے ''مؤمن آل فرعون'' جو فرعون کے رشتہ داروں میں سے تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت توحید قبول کر چکا تھا، لیکن اپنے اس ایمان کو ظاہر نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ اپنے آپ کو خاص طریقے سے موسیٰ علیہ السلام کی حمایت کا پابند سمجھتا تھا جب اس نے دیکھا کہ فرعون کے غیظ وغضب سے موسیٰ علیہ السلام کی جان کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے تو مردانہ وار آگے بڑھا اور اپنی دل نشین اور مؤثر گفتگو سے قتل کی اس سازش کو ناکام بنا دیا۔

قرآن میں فرمایا گیا ہے: ''آل فرعون میں سے ایک شخص نے جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا''

کہا: ''کیا کسی شخص کو صرف اس بناء پر قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے؟'' [2]

''حالانکہ وہ تمہارے ربّ کی طرف سے معجزات اور واضح دلائل اپنے ساتھ لایا ہے۔'' [3]

آیا تم اس کے عصا اور ید بیضاء جیسے معجزات کا انکار کر سکتے ہو؟ کیا تم نے اپنی آنکھوں سے اس کے جادوگروں پر غالب آجانے کا مشاہدہ نہیں کیا؟ یہاں تک کہ جادوگروں نے اس کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دیئے اور ہماری پرواہ تک نہ کی اور نہ ہی ہماری دھمکیوں کو خاطر میں لائے اور موسیٰ کے خدا پر ایمان لا کر اپنا سر اس کے آگے جھکا دیا، ذرا سچ بتاؤ ایسے شخص کو جادوگر کہا جا سکتا ہے،؟ خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو، جلد بازی سے کام نہ لو اور اپنے اس کام کے انجام کو بھی اچھی طرح سوچ لو تا کہ بعد میں پشیمان نہ ہونا پڑے۔

ان سب سے قطع نظر یہ دو حال سے خالی نہیں ''اگر وہ جھوٹا ہے تو جھوٹ اس کا خود ہی دامن گیر ہوگا اور اگر سچا ہے تو کم از کم جس عذاب سے تمہیں ڈرایا گیا ہے وہ کچھ نہ کچھ تو تمہارے پاس پہنچ ہی جائے گا''۔ [4]

یعنی اگر وہ جھوٹا ہے جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، آخر کار ایک نہ ایک دن اس کا پول کھل جائے گا اور وہ اپنے جھوٹ کی سزا پالے گا لیکن یہ امکان بھی تو ہے کہ شاید وہ سچا ہو اور خدا کی جانب سے بھیجا گیا ہو تو پھر ایسی صورت میں اس کے کئے ہوئے وعدے کسی نہ کسی صورت میں وقوع پذیر ہو کر رہیں گے لہٰذا اس کا قتل کرنا عقل وخرد سے کوسوں دور ہے۔

---

[1] سورہ مومن آیت 27

[2] سورہ مومن آیت 28

[3] سورہ مومن آیت 28

[4] سورہ مومن آیت 28

اس سے یہ نتیجہ نکلا، ''اللہ تعالیٰ مسرف اور جھوٹے کی ہدایت نہیں فرماتا''۔ [1]

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام تجاوز و اسراف و دروغ کو اختیار کرتے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کی ہدایت حاصل نہ کرتے اور اگر تم بھی ایسے ہی ہو گئے تو اس کی ہدایت سے محروم ہو جاؤ گے۔

مومن آل فرعون نے اس پر ہی اکتفاء نہیں کی بلکہ اپنی گفتگو کو جاری رکھا، دوستی اور خیر خواہی کے انداز میں ان سے یوں گویا ہوا: اے میری قوم آج مصر کی طویل و عریض سرزمین پر تمہاری حکومت ہے اور تم ہر لحاظ سے غالب اور کامیاب ہو، اس قدر بے انداز نعمتوں کا کفران نہ کرو، اگر خدائی عذاب ہم تک پہنچ گیا تو پھر ہماری کون مدد کرے گا''۔ [2]

ظاہراً اس کی یہ باتیں ''فرعون کے ساتھیوں'' کے لئے غیر مؤثر ثابت نہیں ہوئیں انہیں نرم بھی بنا دیا اور ان کے غصے کو بھی ٹھنڈا کر دیا۔

لیکن یہاں پر فرعون نے خاموشی مناسب نہ سمجھی اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: بات وہی ہے جو میں نے کہہ دی ہے۔ ''جس چیز کا میں معتقد ہوں اسی کا تمہیں بھی حکم دیتا ہوں میں اس بات کا معتقد ہوں کہ ہر حالت میں موسیٰ کو قتل کر دینا چاہئے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے اور میں تو صرف تمہیں صحیح راستہ کی طرف راہنمائی کرتا ہوں''۔ [3]

میں تمہیں خبردار کرتا ہوں

اس دور میں مصر کے لوگ ایک حد تک متمدن اور پڑھے لکھے تھے انہوں نے قوم نوح، عاد اور ثمود جیسی گزشتہ اقوام کے بارے میں مؤرخین کی باتیں بھی سن رکھی تھیں اتفاق سے ان اقوام کے علاقوں کا اس علاقے سے زیادہ فاصلہ بھی نہیں تھا یہ لوگ ان کے دردناک انجام سے بھی کم و بیش واقفیت رکھتے تھے۔

لہٰذا مومن آل فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے منصوبے کی مخالفت کی اس نے دیکھا کہ فرعون کو زبردست اصرار ہے کہ وہ موسیٰ کے قتل سے باز نہیں آئے گا، اس مرد مومن نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور نہ ہی ہارنی چاہئے تھی لہٰذا اب کہ اس نے یہ تدبیر سوچی کہ اس سرکش قوم کو گزشتہ اقوام کی تاریخ اور انجام کی طرف متوجہ کرے شاید اس طرح سے یہ لوگ بیدار ہوں اور اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں قرآن کے مطابق اس نے اپنی بات یوں شروع کی اس باایمان شخص نے کہا: ''اے میری قوم، مجھے تمہارے بارے میں گزشتہ اقوام کے عذاب کے دن کی طرح کا خوف ہے۔'' [4]

پھر اس بات کی تشریح کرتے ہوئے کہا: ''میں قوم نوح علیہ السلام، عاد، ثمود اور ان کے بعد آنے والوں کی سی بری عادت سے ڈرتا ہوں''۔ [5]

ان قوموں کی عادت شرک، کفر اور طغیان و سرکشی تھی اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان کا کیا انجام ہوا؟ کچھ تو تباہ کن طوفانوں کی نذر ہو گئیں، کچھ وحشت ناک جھگڑوں کی وجہ سے برباد ہوئیں، کچھ کو آسمانی بجلی نے جلا کر راکھ کر دیا اور کچھ زلزلوں کی بھینٹ چڑھ کر صفحہ

---

[1] سورہ مومن آیت 28

[2] سورہ مومن آیت 29

[3] سورہ مومن آیت 29

[4] سورہ مومن آیت 31

[5] سورہ مومن آیت 31

ہستی سے مٹ گئیں۔کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ کفر اور طغیان پر اصرار کی وجہ سے تم بھی مذکورہ عظیم بلاؤں میں سے کسی ایک کا شکار ہو سکتے ہو؟ لہٰذا مجھے کہنے دو کہ مجھے تمہارے بارے میں بھی اس قسم کے خطرناک مستقبل کا اندیشہ ہے۔

آیا تمہارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ تمہارے کردار اور افعال ان سے مختلف ہیں؟ آخر ان لوگوں کا کیا قصور تھا کہ وہ اس طرح کے بھیانک مستقبل سے دوچار ہوئے کیا اس کے سوا کچھ اور تھا کہ انھوں نے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کی دعوت کے خلاف قیام کیا، ان کی تکذیب کی بلکہ انہیں قتل کر ڈالا۔

لیکن یاد رکھو جو مصیبت بھی تم پر نازل ہوگی خود تمہارے کئے کی سزا ہوگی کیونکہ ''خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔''[1]

پھر کہتا ہے: ''اے میری قوم میں تمہارے لئے اس دن سے ڈرتا ہوں جس دن لوگ ایک دوسرے کو پکاریں گے لیکن کوئی مدد نہیں کرے گا''۔[2]

ان بیانات کے ذریعے مومن آل فرعون نے جو کچھ کرنا تھا کر دکھایا اس نے فرعون کو جناب موسیٰ کے قتل کی تجویز بلکہ فیصلے کے بارے میں ڈانواڈول کر دیا یا کم از کم اسے ملتوی کروا دیا اسی التواء سے قتل کا خطرہ ٹل گیا اور یہ تھا اس ہوشیار، زیرک اور شجاع مرد خدا کا فریضہ جو اس نے کما حقہ ادا کر دیا جیسا کہ بعد کی گفتگو سے معلوم ہوگا کہ اس سے اس کی جان کے بھی خطرے میں پڑنے کا اندیشہ ہو گیا تھا۔

آخری بات

پانچویں اور آخری مرحلے پر مومن آل فرعون نے تمام حجاب الٹ دیئے اور اس سے زیادہ اپنے ایمان کو نہ چھپا سکا، وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا کہہ چکا اور فرعون والوں نے بھی، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، اس کے بارے میں بڑا خطرناک فیصلہ کیا۔ خداوند عالم نے بھی اپنے اس مومن اور مجاہد بندے کو تنہا نہیں چھوڑا جیسا کہ قرآن نے بیان کیا ہے: ''خدا نے بھی اسے ان کی ناپاک چالوں اور سازشوں سے بچا لیا''۔[3]

اس کی تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ فرعونیوں نے اس کے بارے میں مختلف سازشیں اور منصوبے تیار کر رکھے تھے۔

لیکن وہ منصوبے کیا تھے؟ قرآن نے اس کی تفصیل بیان نہیں کی، ظاہر ہے کہ مختلف قسم کی سزائیں اذیتیں اور آخر کار قتل اور سزائے موت ہو سکتی ہے لیکن خداوند عالم کے لطف و کرم نے ان سب کو ناکام بنا دیا۔

چنانچہ بعض تفسیروں میں ہے کہ وہ ایک مناسب موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام تک پہنچ گیا اور اس نے بنی اسرائیل کے ہمراہ دریائے نیل کو عبور کیا، نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب اس کے قتل کا منصوبہ بن چکا تو اس نے اپنے آپ کو ایک پہاڑ میں چھپا لیا اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

یہ دونوں روایات آپس میں مختلف نہیں ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ پہلے وہ شہر سے مخفی ہو گیا ہو اور پھر بنی اسرائیل سے جا ملا ہو۔

موسیٰ کے خدا کی خبر لاتا ہوں

اگرچہ مومن آل فرعون کی باتوں نے فرعون کے دل پر اس قدر اثر کیا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے قتل سے تو باز آ گیا لیکن پھر بھی غرور

---

[1] سورہ مومن آیت 31

[2] سورہ مومن آیت 32

[3] سورہ مومن آیت 45

کی چوٹی سے نیچے نہ اترا اور اپنی شیطنت سے بھی باز نہ آیا اور نہ ہی حق بات قبول کرنے پر آمادہ ہوا کیونکہ فرعون کے پاس اس بات کی نہ تو صلاحیت تھی اور نہ ہی لیاقت لہٰذا اپنے شیطنت آمیز اعمال کو جاری رکھتے ہوئے اس نے ایک نئے کام کی تجویز پیش کی اور وہ ہے آسمانوں پر چڑھنے کے لئے ایک بلند و بالا برج کی تعمیر تا کہ اس پر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کی خبر لے آئے۔

فرعون نے کہا: اے ہامان: میرے لئے ایک بلند عمارت تیار کرو تا کہ میں اسباب وذرائع تک پہنچ سکوں ایسے اسباب وذرائع جو مجھے آسمانوں تک لے جاسکیں تا کہ میں موسیٰ کے خدا سے باخبر ہوسکوں ہر چند کہ میں گمان کرتا ہوں کہ وہ جھوٹا ہے۔

جی ہاں! اس قسم کے برے اعمال فرعون کی نظر میں مزین کر دیئے گئے تھے اور انھوں نے اسے راہ حق سے روک دیا تھا، لیکن فرعون کی سازش اور چالوں کا انجام نقصان اور تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ [1]

سب سے پہلی چیز جو یہاں پر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ آخر اس کام سے فرعون کا مقصد کیا تھا؟ آیا وہ واقعاً اس حد تک احمق تھا کہ گمان کرنے لگا کہ موسیٰ کا خدا آسمان میں ہے؟ بالفرض اگر آسمان میں ہو بھی تو آسمان سے باتیں کرنے والے پہاڑوں کے ہوتے ہوئے اس عمارت کے بنانے کی کیا ضرورت تھی جو پہاڑوں کی اونچائی کے سامنے بالکل ناچیز تھی؟ اور کیا اس طرح سے وہ آسمان تک پہنچ بھی سکتا تھا؟

یہ بات تو بہت ہی بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ فرعون مغرور اور متکبر ہونے کے باوجود سمجھ دار اور سیاستداں شخص تو ضرور تھا جس کی وجہ سے اس نے ایک عظیم ملت کو اپنی زنجیروں میں جکڑا تھا اور بڑے زوردار طریقے سے اس پر حکومت کرتا رہا لہٰذا اس قسم کے افراد کی ہر ہر بات اور ہر ہر حرکت شیطانی حرکات وسکنات کی آئینہ دار ہوتی ہیں لہٰذا سب سے پہلے اس کے اس شیطانی منصوبے کا تجزیہ وتحلیل کرنا چاہئے کہ آخر ایسی عمارت کی تعمیر کا مقصد کیا تھا؟

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے ان چند مقاصد کے پیش نظر ایسا اقدام کیا:

1۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگوں کی فکر کو مصروف رکھے موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور بنی اسرائیل کے قیام کے مسئلہ سے ان کی توجہ ہٹانے کے لئے اس نے یہ منصوبہ تیار کیا، بعض مفسرین کے بقول یہ عمارت ایک نہایت ہی وسیع وعریض زمین میں کھڑی کی گئی جس پر پچاس ہزار مزدور کام کرنے لگے اس تعمیری منصوبے نے دوسرے تمام مسائل کو بھلا دیا جوں جوں عمارت بلند ہوتی جاتی تھی توں توں لوگوں کی توجہ اس کی طرف زیادہ مبذول ہوتی تھی ہر جگہ اور ہر محفل میں نئی خبر کے عنوان سے اس کے چرچے تھے اس نے وقتی طور پر جادوگروں پر موسیٰ علیہ السلام کی کامیابی کو جو کہ فرعون اور فرعونیوں کے پیکر پر ایک کاری ضرب تھی لوگوں کے ذہنوں سے فراموش کر دیا۔

2۔ وہ چاہتا تھا کہ اس طرح سے زحمت کش اور مزدور طبقے کی جزوی مادی اور اقتصادی امداد کرے اور عارضی طور پر ہی سہی بیکار لوگوں کے لئے کام مہیا کرے تا کہ تھوڑا سا اس کے مظالم کو فراموش کر دیں اور اس کے خزانے کی لوگوں کو زیادہ سے زیادہ احتیاج محسوس ہو۔

3۔ پروگرام یہ تھا کہ جب عمارت پایہ تکمیل کو پہنچ جائے، تو وہ اس پر چڑھ کر آسمان کی طرف نگاہ کرے اور شاید چلہ کمان میں رکھ کر تیر چلائے اور وہ واپس لوٹ آئے تو لوگوں کو احمق بنانے کے لئے کہے کہ موسیٰ کا خدا جو کچھ بھی تھا آج اس کا خاتمہ ہو گیا ہے اب ہر شخص بالکل مطمئن ہو کر اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جائے۔

---

[1] سورہ مومن آیت 37

وگرنہ فرعون کے لئے تو صاف ظاہر تھا کہ اس کی عمارت جتنی بھی بلند ہو چند سو میٹر سے زیادہ تو اونچی نہیں جا سکتی تھی جبکہ آسمان اس سے کئی گنا بلند اور اونچے تھے، پھر یہ کہ اگر بلند ترین مقام پر بھی کھڑے ہو کر آسمان کی طرف دیکھا جائے تو اس کا منظر بغیر کسی کمی بیشی کے ویسے ہی نظر آتا ہے جیسے سطح زمین سے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ فرعون نے یہ بات کر کے درحقیقت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے سے ایک قسم کی پسپائی اختیار کی جبکہ اس نے کہا کہ میں موسیٰ کے خدا کے بارے میں تحقیق کرنا چاہتا ہوں ''فاطلع الی الہ موسیٰ'' اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ ''ہر چند کہ میں اسے جھوٹا گمان کرتا ہوں'' اس طرح سے وہ یقین کی منزل سے ہٹ کر شک اور گمان کے مرحلے تک نیچے آجاتا ہے۔

اس مسئلے میں مفسرین کے ایک گروہ نے (مثلاً فخر رازی اور آلوسی نے) یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ آیا: فرعون نے اپنا مجوزہ بلند مینار تعمیر کرایا تھا یا نہیں؟

ان مفسرین کا ذہن اس طرف اس لئے منتقل ہوا کہ مینار کی تعمیر کا کام کسی طرح بھی عاقلانہ نہ تھا کیا اس عہد کے لوگ کبھی بلند پہاڑوں پر نہیں چڑھے تھے؟ اور انھوں نے آسمان کے منظر کو ویسا ہی نہیں دیکھا تھا جیسا کہ وہ زمین سے نظر آتا ہے؟ کیا انسان کا بنایا ہوا مینار پہاڑ سے زیادہ اونچا ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی احمق بھی یہ یقین کر سکتا ہے کہ ایسے مینار پر چڑھ کر آسمان کو چھوا جا سکتا ہے؟

لیکن وہ مفسرین جنہوں نے یہ اشکالات پیدا کئے ہیں ان کی توجہ ان نکات کی طرف نہیں گئی کہ اول تو ملک مصر کوہستانی نہیں دوم یہ کہ انہوں نے اس عہد کے لوگوں کی سادہ لوحی کو فراموش کر دیا کہ ان سیدھے سادھے لوگوں کو ایسے ہی مسائل سے غافل کیا جا سکتا تھا یہاں تک کہ خود ہمارے زمانے جسے عصر علم و دانش کہا جاتا ہے، لوگوں کی توجہ اصل مسائل سے ہٹانے کے لئے کیسے کیسے مکر و فریب اور حیلہ سازیاں کی جاتی ہیں۔

پچاس ہزار معمار برج بناتے ہیں

بہر کیف۔ بعض تواریخ کے بیان کے مطابق، ہامان نے حکم دیا کہ ایسا محل اور برج بنانے کے لئے زمین کا ایک وسیع قطعہ انتخاب کریں اور اس کی تعمیر کے لئے پچاس ہزار معمار اور مزدور روانہ کر دے اور اس عمارت کے واسطے مٹیریل فراہم کرنے کے لئے ہزاروں آدمی مقرر کئے گئے اس نے خزانہ کا منہ کھول دیا اور اس مقصد کے لئے کثیر رقم خرچ کی یہاں تک کہ تمام ملک مصر میں اس عظیم برج کی تعمیر کی شہرت ہو گئی۔

یہ عمارت جس قدر بھی بلند سے بلند تر، ہوتی جاتی تھی لوگ اتنے ہی زیادہ اسے دیکھنے آتے تھے اور منتظر تھے کہ دیکھئے فرعون یہ عمارت بنا کر کیا کرتا ہے؟

یہ عمارت اتنی بلند ہو گئی کہ اس سے دور دور تک اطراف و جوانب کا میدان نظر آنے لگا بعض مؤرّخین نے لکھا ہے کہ معماروں نے اس کی سیڑھیاں ایسی بنائی تھیں کہ آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر اس پر چڑھ سکتا تھا۔

میں نے موسیٰ علیہ السلام کے خدا کو مار اڈالا جب وہ عمارت پایہ تکمیل کو پہنچ گئی اور اسے مزید بلند کرنے کا کوئی امکان نہ رہا تو ایک روز فرعون پوری شان و شوکت سے وہاں آیا اور بذات خود برج پر چڑھ گیا جب وہ برج کی چوٹی پر پہنچا اور آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو اسے آسمان ویسا ہی نظر آیا جیسا کہ وہ زمین سے دیکھا کرتا تھا اس منظر میں ذرا بھی تغیر و تبدیلی نہ تھی۔

مشہور یہ ہے کہ اس نے مینار پر چڑھ کے کمان میں تیر جوڑا اور آسمان کی طرف پھینکا یا تو وہ تیر کسی پرندے کے لگا یا پہلے

سے کوئی سازش کی گئی تھی کہ تیر خون آلود واپس آیا تب فرعون وہاں سے نیچے اتر آیا اور لوگوں سے کہا: جاؤ، مطمئن رہو اور کسی قسم کی فکر نہ کرو میں نے موسیٰ کے خدا کو مار ڈالا ہے۔

یہ بات حتمی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ سادہ لوحوں اور اندھی تقلید کرنے والوں کے ایک گروہ نے اور ان لوگوں نے جن کی آنکھیں اور کان حکومت وقت کے پروپیگنڈے سے بند ہو گئے تھے، فرعون کے اس قول کا یقین کر لیا ہوگا اور ہر جگہ اس خبر کو عام کیا ہوگا اور مصر کی رعایا کو غافل رکھنے کا ایک اور سبب پیدا ہو گیا۔

مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ عمارت دیر تک قائم نہیں رہی (اور اسے رہنا بھی نہ چاہئے تھا) تباہ ہوگئی بہت سے لوگ اس کے نیچے دب کے مر گئے اس سلسلے میں اہل قلم نے اور بھی طرح طرح کی داستانیں لکھی ہیں لیکن ان کی صحت کی تحقیق نہ ہوسکی اس لئے انہیں قلم زد کر دیا گیا ہے۔

بیدار کرنے والی سزائیں

ایک کلی قانون تمام پیغمبروں کے لئے یہ تھا کہ جب ان کو لوگوں کی مخالفت کا سامنا ہو اور وہ کسی طرح سے راہ راست پر نہ آئیں تو خدا ان کو بیدار کرنے کے لئے مشکلات و مصائب میں گرفتار کرتا تھا تا کہ وہ اپنے میں نیازمندی اور محتاجی کا احساس کریں، اور ان کی فطرت توحید جو آرام و آسائش کی وجہ سے غفلت کے پردوں میں چلی گئی ہے دوبارہ ابھر آئے اور ان کو اپنی ضعف و ناتوانی کا اندازہ ہو اور اس قادر و توانا ہستی کی جانب متوجہ ہوں جو ہر نعمت و نقمت کا سرچشمہ ہے۔

قرآن میں اس مطلب کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے: ہم نے آل فرعون کو قحط، خشک سالی اور ثمرات کی کمی میں مبتلا کیا کہ شاید متوجہ اور بیدار ہو جائیں۔[1]

باوجودیکہ قحط سالی نے فرعونیوں کو گھیر لیا تھا لیکن مذکورہ بالا بیان میں صرف فرعون کے مخصوصین کا ذکر کیا گیا ہے مقصد یہ ہے کہ اگر یہ بیدار ہو گئے تو سب لوگ بیدار ہو جائیں گے کیونکہ تمام لوگوں کی نبض انہی کے ہاتھوں میں ہے یہ چاہیں تو بقیہ افراد کو گمراہ کریں یا ہدایت کریں۔

اس نکتہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ خشک سالی اہل مصر کے لئے ایک بلائے عظیم شمار ہوتی تھی کیونکہ مصر پورے طور سے ایک زرعی مملکت تھی اس بناء پر اگر زراعت نہ ہو تو اس کا اثر ملک کے تمام افراد پر پڑتا ہے لیکن مسلمہ طور پر فرعون اور اس کے افراد چونکہ ان زمینوں کے مالک اہلی تھے اس لئے فی الحقیقت وہ سب سے زیادہ اس سے متاثر ہوئے تھے۔

ضمناً یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ خشک سالی کئی سال تک باقی رہی کیونکہ ''سنین'' جمع کا صیغہ ہے۔

لیکن آل فرعون، بجائے اس کے کہ ان الٰہی تنبیہوں سے نصیحت لیتے اور خواب خرگوش سے بیدار ہوتے انہوں نے اس سے سوء استفادہ کیا اور ان حوادث کی من مانی تفسیر کی، جب حالات ان کے منشا کے مطابق ہوتے تھے تو وہ راحت و آرام میں ہوتے تھے اور کہتے کہ یہ حالات ہماری نیکی و لیاقت کی وجہ سے ہیں: ''فی الحقیقت ہم اس کے اہل و لائق ہیں''۔

لیکن جس وقت وہ مشکل و مصیبت میں گرفتار ہوتے تھے تو اس کو فوراً موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے سر باندھ دیتے تھے'' اور کہتے تھے کہ یہ ان کی بدقدمی کی وجہ سے ہوا ہے۔

---

[1] سورہ اعراف آیت 130

لیکن قرآن کریم ان کے جواب میں کہتا ہے: ''ان کی بدبختیوں اور تکلیفوں کا سرچشمہ خدا کی طرف سے ہے خدا نے یہ چاہا ہے کہ اس طرح ان کو ان کے اعمال بد کی وجہ سے سزا دے لیکن ان میں سے اکثر اس کو نہیں جانتے''۔ [1]

مختلف اور پیہم بلاؤں کا نزول

قرآن میں ان بیدار کنندہ دروس کا ایک اور مرحلہ بیان کیا گیا ہے جو خدا نے قوم فرعون کو دیئے جب مرحلہ اول یعنی قحط، خشک سالی اور مالی نقصانات نے ان کو بیدار نہ کیا تو دوسرے مرحلہ کی نوبت پہنچی جو پہلے مرحلہ سے شدید تر تھا اس مرتبہ خدا نے ان کو پے در پے ایسی بلاؤں میں جکڑا جو ان کو اچھی طرح سے کچلنے والی تھیں مگر افسوس ان کی اب بھی آنکھیں نہ کھلیں۔

پہلے ان بلاؤں کے نزول کے مقدمہ کے طور پر فرمایا گیا ہے: انہوں نے موسیٰ کی دعوت کے مقابلے میں اپنے عناد کو بدستور باقی رکھا اور ''کہا کہ تم ہر چند ہمارے لئے نشانیاں لاؤ اور ان کے ذریعے ہم پر اپنا جادو کرو ہم کسی طرح بھی تم پر ایمان نہیں لائیں گے''۔ [2]

لفظ ''آیت'' شاید انہوں نے از راہ تمسخر استعمال کیا تھا، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے معجزات کو آیات الٰہی قرار دیا تھا لیکن انہوں نے سحر قرار دیا۔

آیات کا لہجہ اور دیگر قرائن اس بات کے مظہر ہیں کہ فرعون کے پروپیگنڈوں کا محکمہ جو اپنے زمانے کے لحاظ سے ہر طرح کے ساز و سامان سے لیس تھا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف ہر طرف سے حرکت میں آ گیا تھا اس کے نتیجے میں تمام لوگوں کا ایک ہی نعرہ تھا اور وہ یہ کہ اے موسیٰ تم تو ایک زبردست جادوگر ہو، کیونکہ موسیٰ کی بات کو رد کرنے کا ان کے پاس اس سے بہتر کوئی جواب نہ تھا جس کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں وہ گھر بنانا چاہتے تھے۔

لیکن چونکہ خدا کسی قوم پر اس وقت تک اپنا آخری عذاب نازل نہیں کرتا جب تک کہ اس پر خوب اچھی طرح سے اتمام حجت نہ کر لے اس لئے بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے پہلے طرح طرح کی بلائیں ان پر نازل کیں کہ شاید ان کو ہوش آ جائے۔ [3]

''پہلے ہم نے ان پر طوفان بھیجا''

اس کے بعد قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: ''اس کے بعد ہم نے ان کی زراعتوں اور درختوں پر ٹڈیوں کو مسلط کر دیا۔''

روایات میں وارد ہوا ہے کہ اللہ نے ان پر ٹڈیاں اس کثرت سے بھیجیں کہ انھوں نے درختوں کے شاخ و برگ کا بالکل صفایا کر دیا، حتیٰ کہ ان کے بدنوں تک کو وہ اتنا آزار پہنچاتی تھیں کہ وہ تکلیف سے چیختے چلاتے تھے۔

جب بھی ان پر بلا نازل ہوتی تھی تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کرتے تھے کہ وہ خدا سے کہہ کر اس بلا کو ہٹوا دیں طوفان اور ٹڈیوں کے موقع پر بھی انھوں نے جناب موسیٰ علیہ السلام سے یہی خواہش کی، جس کو موسیٰ علیہ السلام نے قبول کر لیا اور یہ دونوں بلائیں برطرف ہو گئیں، لیکن اس کے بعد پھر وہ اپنی ضد پر اتر آئے جس کے نتیجے میں تیسری بلا ''قمّل'' کی ان پر نازل ہوئی۔

''قمّل'' سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان گفتگو ہوئی ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ ایک قسم کی نباتی آفت تھی جو زراعت کو کھا جاتی تھی۔

---

[1] سورہ اعراف آیت 131

[2] سورہ اعراف آیت 132

[3] سورہ اعراف کی آیت 133 میں ان بلاؤں کا نام لیا گیا ہے

جب یہ آفت بھی ختم ہوئی اور وہ پھر بھی ایمان نہ لائے ،تو اللہ نے مینڈک کی نسل کو اس قدر فروغ دیا کہ مینڈک ایک نئی بلا کی صورت میں ان کی زندگی میں داخل ہو گئے۔

جدھر دیکھتے تھے ہر طرف چھوٹے بڑے مینڈک نظر آتے تھے یہاں تک کہ گھروں کے اندر، کمروں میں، بچھونوں میں، دسترخوان پر کھانے کے برتنوں میں مینڈک ہی مینڈک تھے، جس کی وجہ سے ان کی زندگی حرام ہو گئی تھی، لیکن پھر بھی انھوں نے حق کے سامنے اپنا سر نہ جھکایا اور ایمان نہ لائے۔ اس وقت اللہ نے ان پر خون مسلط کیا۔

بعض مفسرین نے کہا کہ خون سے مراد ''مرض نکسیر'' ہے جو ایک وبا کی صورت میں ان میں پھیل گیا، لیکن بہت سے مفسرین نے لکھا ہے کہ دریائے نیل لہو رنگ ہو گیا اتنا کہ اس کا پانی مصرف کے لائق نہ رہا۔

آخر میں قرآن فرماتا ہے: ''ان معجزوں اور کھلی نشانیوں کو جو موسیٰ کی حقانیت پر دلالت کرتی تھیں، ہم نے ان کو دکھلایا لیکن انھوں نے ان کے مقابلہ میں تکبر سے کام لیا اور حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور وہ ایک مجرم اور گناہگار قوم تھے۔''[1]

بعض روایات میں ہے کہ ان میں سے ہر ایک بلا ایک ایک سال کے لئے آتی تھی یعنی ایک سال طوفان وسیلاب، دوسرے سال ٹڈیوں کے دَل، تیسرے سال نباتاتی آفت، اسی طرح آخر تک، لیکن دیگر روایات میں ہے کہ ایک آفت سے دوسری آفت تک ایک مہینہ سے زیادہ فاصلہ نہ تھا، بہر کیف اس میں شک نہیں کہ ان آفتوں کے درمیان فاصلہ موجود تھا (جیسا کہ قرآن نے لفظ ''مفصلات'' سے تعبیر کیا ہے) تا کہ ان کو تفکر کے لئے کافی موقع مل جائے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ بلائیں صرف فرعون اور فرعون والوں کے دامن گیر ہوتی تھیں، بنی اسرائیل اس سے محفوظ تھے، بے شک یہ اعجاز ہی تھا، لیکن اگر نکتہ ذیل پر نظر کی جائے تو ان میں سے بعض کی علمی توجیہہ بھی کی جا سکتی ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ مصر جیسی سرسبز و شاداب اور خوبصورت سلطنت جو دریائے نیل کے کناروں پر آباد تھی اس کے بہترین حصے وہ تھے جو دریا سے قریب تھے وہاں پانی بھی فراوان تھا اور زراعت بھی خوب ہوتی تھی، تجارتی کشتیاں وغیرہ بھی دستیاب تھیں، یہ خطے فرعون والوں اور قبطیوں کے قبضے میں تھے جہاں انھوں نے اپنے قصر و باغات بنا رکھے تھے اس کے برخلاف اسرائیلوں کو دور دراز کے خشک اور کم آب علاقے دیئے گئے تھے جہاں وہ زندگی کے یہ سخت دن گذارتے تھے کیونکہ ان کی حیثیت غلاموں جیسی تھی۔

بنابراین یہ ایک طبیعی امر ہے کہ جب سیلاب اور طوفان آیا تو اس کے نتیجے میں وہ آبادیاں زیادہ متاثر ہوئیں جو دریائے نیل کے دونوں کناروں پر آباد تھیں، اسی طرح مینڈک بھی پانی سے پیدا ہوتے ہیں جو قبطیوں کے گھروں کے آس پاس بڑی مقدار میں موجود تھے، یہی حال خون کا ہے کیونکہ دریائے نیل کا پانی خون ہو گیا تھا، ٹڈیاں اور زرعی آفتیں بھی باغات، کھیتوں اور سرسبز علاقوں پر حملہ کرتی ہیں، لہٰذا ان عذابوں سے زیادہ تر نقصان قبطیوں ہی کا ہوتا تھا۔

جو کچھ قرآن میں ذکر ہوا ہے اس کا ذکر موجودہ توریت میں بھی ملتا ہے، لیکن کسی حد تک فرق کے ساتھ۔[2]

بار بار کی عہد شکنیاں

قرآن میں فرعونیوں کے اس ردعمل کا ذکر کیا گیا ہے جو انہوں نے پروردگار عالم کی عبرت انگیز اور بیدار کنندہ بلاؤں کے

---

[1] سورہ اعراف آیت 133

[2] ملاحظہ ہو سفر خروج فصل ہفتم تا دہم توریت

نزول کے بعد ظاہر کیا، ان تمام قرآنی گفتگو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس وقت وہ بلا کے چنگل میں گرفتار ہوجاتے تھے، جیسا کہ عام طور سے تباہ کاروں کا دستور ہے، وقتی طور پر خواب غفلت سے بیدار ہوجاتے تھے اور فریاد وزاری کرنے لگتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کرتے تھے کہ خدا سے ان کی نجات کے لئے دعا کریں۔ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے لئے دعا کرتے تھے اور وہ بلا ان کے سروں سے ٹل جاتی تھی، مگر ان کی حالت یہ تھی کہ جونہی وہ بلا سر سے ٹلتی تھی تو وہ تمام چیزوں کو بھول جاتے تھے اور وہ اپنی پہلی نا فرمانی اور سرکشی کی حالت پر پلٹ جاتے تھے۔

جس وقت ان پر بلا مسلط ہوتی تھی تو کہتے تھے: ''اے موسیٰ ہمارے لئے اپنے خدا سے دعا کرو کہ جو عہد اس نے تم سے کیا ہے اسے پورا کرے اور تمہاری دعا ہمارے حق میں قبول کرے، اگر تم یہ بلا ہم سے دور کردو تو ہم یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم خود بھی تم پر ضرور ایمان لائیں گے اور بنی اسرائیل کو بھی یقیناً تمہارے ہمراہ روانہ کردیں گے''۔ [1]

اس کے بعد ان کی پیمان شکنی کا ذکر کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''جس وقت ہم ان پر سے بلاؤں کو تعین شدہ مدت کے بعد ہٹا دیتے تھے تو وہ اپنا وعدہ توڑ ڈالتے تھے''۔ [2]

نہ خود ہی ایمان لاتے تھے اور نہ ہی بنی اسرائیل کو اسیری سے آزاد کرتے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کا یک مدت معین کرتے تھے کہ فلاں وقت یہ بلا برطرف ہوجائے گی تا کہ ان پر اچھی طرح کھل جائے کہ یہ بلا کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کی وجہ سے تھا۔

موسیٰ علیہ السلام کے پاس سونے کے کنگن کیوں نہیں؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی منطق ایک طرف ان کے مختلف معجزات دوسری طرف مصر کے لوگوں پر نازل ہونیوالی بلائیں جو موسیٰ علیہ السلام کی دعا کی برکت سے ٹل جاتی تھیں تیسری طرف، ان سب اسباب نے مجموعی طور پر اس ماحول پر گہرے اثرات ڈالے اور فرعون کے بارے میں لوگوں کے افکار کو ڈانواں ڈول کردیا اور انہیں پورے مذہبی اور معاشرتی نظام کے بارے میں سوچنے پر مجبور کردیا۔

اس موقع پر فرعون نے دھوکہ دہی کے ذریعہ موسیٰ علیہ السلام کا اثر مصری لوگوں کے ذہن سے ختم کرنے کی کوشش کی اور پست اقدار کا سہارا لیا جو اس ماحول پر حکم فرما تھا، انہیں اقدار کے ذریعہ اپنا اور موسیٰ علیہ السلام کا موازنہ شروع کردیا تا کہ اس طرح لوگوں پر اپنی برتری کو پایۂ ثبوت تک پہنچائے، جیسا کہ قرآن پاک کہتا ہے:

''اور فرعون نے اپنے لوگوں کو پکار کر کہا: اے میری قوم آیا مصر کی وسیع وعریض سرزمین پر میری حکومت نہیں ہے اور کیا یہ عظیم دریا میرے حکم سے نہیں بہہ رہے ہیں اور میرے محلوں، کھیتوں اور باغوں سے نہیں گزر رہے ہیں؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟'' [3]

لیکن موسیٰ علیہ السلام کے پاس کیا ہے، کچھ بھی نہیں، ایک لاٹھی اور ایک اونی لباس اور بس، تو کیا اس کی شخصیت بڑی ہوگی یا میری؟ آیا وہ سچ بات کہتا ہے یا میں؟ اپنی آنکھیں کھولو اور بات اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس طرح فرعون نے مصنوعی اقدار کو لوگوں کے سامنے پیش کیا، بالکل ویسے ہی جیسے عصر جاہلیت کے بت پرستوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے میں مال ومقام کو صحیح

---

[1] اعراف آیت 134

[2] سورہ اعراف آیت 135

[3] سورہ زخرف آیت 51

انسانی اقدار سمجھ رکھا تھا۔

لفظ "نادیٰ" (پکار کر کہا) سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے اپنی مملکت کے مشاہیر کی ایک عظیم محفل جمائی اور بلند آواز کے ساتھ ان سب کو مخاطب کرتے ہوئے یہ جملے ادا کیے، یا حکم دیا کہ اس کی اس آواز کو ایک سرکاری حکم نامے کے ذریعے پورے ملک میں بیان کیا جائے۔

قرآن آگے چل کر فرماتا ہے کہ فرعون نے کہا: ''میں اس شخص سے برتر ہوں جو ایک پست خاندان اور طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور صاف طور پر بات بھی نہیں کر سکتا''۔ [1]

اس طرح سے اس نے اپنے لئے دو بڑے اعزازات (حکومت مصر اور نیل کی مملکت) اور موسیٰ علیہ السلام کے دو کمزور پہلو (فقر اور لکنت زبان) بیان کر دیئے۔

حالانکہ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت نہ تھی۔ کیونکہ خدا نے ان کی دعا کو قبول فرما لیا تھا اور زبان کی لکنت کو دور کر دیا تھا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے مبعوث ہوتے ہی خدا سے یہ دعا مانگی تھی کہ۔ ''خداوندا میری زبان کی گرہیں کھول دے''۔ [2] اور یقیناً ان کی دعا قبول ہوئی اور قرآن بھی اس بات پر گواہ ہے۔ بے پناہ دولت، فاخرہ لباس اور چکا چوند کرتے محلات، مظلوم طبقے پر ظلم و ستم کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کا مالک نہ ہونا صرف عیب کی بات ہی نہیں بلکہ باعث صد افتخار شرافت اور عزت کا سبب بھی ہے۔

"مھین" (پست) کی تعبیر سے ممکن ہے اس دور کے اجتماعی طبقات کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ اس دور میں بڑے بڑے سرمایہ داروں کا معاشرہ کے بلند طبقوں میں شمار ہوتا تھا اور محنت کشوں اور کم آمدنی والے لوگوں کا پست طبقے میں، یا پھر ممکن ہے موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ان کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا اور فرعون کی قبطی قوم اپنے آپ کو سردار اور آقا سمجھتی تھی۔ پھر فرعون دو اور بہانوں کا سہارا لیتے ہوئے کہتا ہے: ''اسے سونے کے کنگن کیوں نہیں دیئے اور اس کے لئے مددگار کیوں نہیں مقرر کئے تا کہ وہ اس کی تصدیق کریں؟'' اگر خدا نے اسے رسول بنایا ہے تو اسے (دوسرے لوگوں کی طرح) طلائی کنگن کیوں نہیں دیئے گئے اور اس کے لئے مددگار کیوں نہیں مقرر کئے گئے۔

کہتے ہیں کہ فرعونی قوم کا عقیدہ تھا کہ روساء اور سربراہوں کو ہمیشہ طلائی کنگنوں اور سونے کے ہاروں سے مزین ہونا چاہئے اور چونکہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس اس قسم کے زیورات نہیں تھے بلکہ ان زیورات کے بجائے وہ چرواہوں والا موٹا سا اونی کرتا زیب تن کئے ہوئے تھے، لہٰذا ان لوگوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا اور یہی حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو انسانی شخصیت کے پرکھنے کا معیار سونا، چاندی اور دوسرے زیورات کو سمجھتے ہیں۔

جناب موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے اونی لباس

اس بارے میں ایک نہایت عمدہ بیان آیا ہے، امام علی بن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں: موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی (ہارون) کے ساتھ فرعون کے دربار میں پہنچے دونوں کے بدن پر اونی لباس اور ہاتھوں میں عصا تھا اس حالت میں انھوں نے شرط پیش کی کہ اگر فرمان الٰہی کے سامنے جھک جائے تو اس کی حکومت اور ملک باقی اور اقتدار قائم و برقرار رہے گا، لیکن فرعون نے حاضرین سے کہا: تمہیں ان کی

---

[1] سورہ زخرف آیت 52

[2] سورہ طٰہٰ آیت 27

باتوں پر تعجب نہیں ہوتا کہ میرے ساتھ شرط لگا رہے ہیں کہ میرے ملک کی بقا اور میری عزت کا دوام ان کی مرضی کے ساتھ وابستہ ہے جبکہ ان کا اپنا حال یہ ہے کہ فقر و تنگدستی ان کی حالت اور صورت سے ٹپک رہی ہے (اگر یہ سچ کہتے ہیں تو) خود انہیں طلائی کنگن کیوں نہیں دیئے گئے۔

دوسرا بہانہ وہی مشہور بہانہ ہے جو بہت سی گمراہ اور سرکش امتیں انبیاء کرام علیہم السلام کے سامنے پیش کیا کرتی تھیں، کبھی تو کہتی تھیں کہ ''وہ انسان کیوں ہے اور فرشتہ کیوں نہیں؟ اور کبھی کہتی تھی کہ اگر وہ انسان ہے تو پھر کم از کم اس کے ہمراہ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا؟''

حالانکہ انسانوں کی طرف بھیجے ہوئے رسولوں کو روح انسانی کا حامل ہونا چاہئے تا کہ وہ ان کی ضرورتوں، مشکلوں اور مسائل کو محسوس کر سکیں اور انہیں ان کا جواب دے سکیں اور عملی لحاظ سے ان کے لئے نمونہ اور اسوہ قرار پا سکیں۔

چوتھا مرحلہ انقلاب کی تیاری

حضرت موسیٰ علیہ السلام میدان مقابلہ میں فرعون پر غالب آ گئے اور سرخرو اور سرفراز ہو کر میدان سے باہر آئے اگر چہ فرعون اور اس کے تمام درباری ان پر ایمان نہ لائے لیکن اس کے چند اہم نتائج ضرور برآمد ہوئے، جن میں سے ہر ایک اہم کامیابی شمار ہوتا ہے۔

1۔ بنی اسرائیل کا اپنے رہبر اور پیشوا پر عقیدہ مزید پختہ ہو گیا اور انہیں مزید تقویت مل گئی چنانچہ ایک دل اور ایک جان ہو کر ان کے گرد جمع ہو گئے کیونکہ انھوں نے سالہا سال کی بدبختی اور در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اب اپنے اندر کسی آسمانی پیغمبر کو دیکھا تھا جو کہ ان کی ہدایت کا بھی ضامن تھا اور ان کے انقلاب، آزادی اور کامیابی کا بھی رہبر تھا۔

2۔ موسیٰ علیہ السلام نے مصریوں اور قبطیوں تک کے درمیان ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ کچھ لوگ ان کی طرف مائل ہو گئے اور جو مائل نہیں ہوئے تھے وہ کم از کم ان کی مخالفت سے ضرور گھبراتے تھے اور جناب موسیٰ علیہ السلام کی صدائے دعوت تمام مصر میں گونجنے لگی۔

3۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ فرعون عوامی افکار اور اپنی جان کو لاحق خطرے سے بچاؤ کے لئے اپنے اندر ایسے شخص کے ساتھ مقابلے کی طاقت کھو چکا تھا جس کے ہاتھ میں اس قسم کا عصا اور منہ میں اس طرح کی گویا زبان تھی۔

مجموعی طور پر یہ امور موسیٰ علیہ السلام کے لئے اس حد تک زمین ہموار کرنے میں معاون ثابت ہوئے کہ مصریوں کے اندر ان کے پاؤں جم گئے اور انھوں نے کھل کر اپنا تبلیغی فریضہ انجام دیا اور اتمام حجت کی۔

قرآن میں فرعونیوں کے خلاف بنی اسرائیل کے قیام اور انقلاب کا ایک اور مرحلہ بیان کیا گیا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ خدا فرماتا ہے: ''ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ سرزمین مصر میں اپنی قوم کے لئے گھروں کا انتخاب کرو''۔ [1]

''اور خصوصیت کے ساتھ ان گھروں کو ایک دوسرے کے قریب اور آمنے سامنے بناؤ''۔ [2]

پھر روحانی طور پر اپنی خود سازی اور اصلاح کرو ''اور نماز قائم کرو۔'' اس طرح سے اپنے نفس کو پاک اور قوی کرو [3] اور اس لئے کہ خوف اور وحشت کے آثار ان کے دل سے نکل جائیں اور وہ روحانی و انقلابی قوت پا لیں ''مومنین کو بشارت

---

[1] سورہ یونس آیت 87

[2] سورہ یونس آیت 87

[3] سورہ یونس آیت 87

دو'' کامیابی اور خدا کے لطف و رحمت کی بشارت۔ [1]

زیر بحث آیات کے مجموعی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بنی اسرائیل منتشر، شکست خوردہ، وابستہ، طفیلی، آلودہ اور خوف زدہ گروہ کی شکل میں تھے، نہ ان کے پاس گھر تھے نہ کوئی مرکز تھا، نہ ان کے پاس معنوی اصلاح کا کوئی پروگرام تھا اور نہ ہی ان میں اس قدر شجاعت، عزم اور حوصلہ تھا جو شکست دینے والے انقلاب کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو حکم ملا کہ وہ بنی اسرائیل کی مرکزیت کے لئے خصوصاً روحانی حوالے سے چند امور پر مشتمل پروگرام شروع کریں۔

1۔ مکان تعمیر کریں اور اپنے مکانات فرعونیوں سے الگ بنائیں۔ اس میں متعدد فائدے تھے۔
ایک یہ کہ سرزمین مصر میں ان کے مکانات ہوں گے تو وہ اس کا دفاع زیادہ لگاؤ سے کریں گے۔
دوسرا یہ کہ قبطیوں کے گھروں میں طفیلی زندگی گزارنے کے بجائے وہ اپنی ایک مستقل زندگی شروع کر سکیں گے۔
تیسرا یہ کہ انکے معاملات اور تدابیر کے راز دشمنوں کے ہاتھ نہیں لگیں گے۔

2۔ اپنے گھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے اور قریب قریب بنائیں، بنی اسرائیل کی مرکزیت کے لئے یہ ایک مؤثر کام تھا اس طرح سے وہ اجتماعی مسائل پر مل کر غور و فکر کر سکتے تھے اور مذہبی مراسم کے حوالے سے جمع ہو کر اپنی آزادی کے لئے ضروری پروگرام بنا سکتے تھے۔

3۔ عبادت کی طرف متوجہ ہوں، خصوصاً نماز کی طرف کہ جو انسان کو بندوں کی بندگی سے جدا کرتی ہے اور اس کا تعلق تمام قدرتوں کے خالق سے قائم کر دیتی ہے۔ اس کے دل اور روح کو گناہ کی آلودگی سے پاک کرتی ہے اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کا احساس زندہ کرتی ہے اور قدرت پروردگار کا سہارا لے کر انسانی جسم میں ایک تازہ روح پھونک دیتی ہے۔

4۔ ایک رہبر کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی روحوں میں موجود طویل غلامی اور ذلت کے دور کا خوف و وحشت نکال باہر پھینکیں اور حتمی فتح و نصرت، کامیابی اور پروردگار کے لطف و کرم کی بشارت دے کر مومنین کے ارادے کو مضبوط کریں اور ان میں شہامت و شجاعت کی پرورش کریں۔

اس روش کو کئی سال گزر گئے اور اس دوران میں موسیٰ علیہ السلام نے اپنے منطقی دلائل کے ساتھ ساتھ انہیں کئی معجزے بھی دکھائے۔

ہم نے انہیں باہر نکال دیا

جب موسیٰ علیہ السلام ان لوگوں پر اتمام حجت کر چکے اور مومنین و منکرین کی صفیں ایک دوسرے سے جدا ہو گئیں تو موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے کوچ کرنے کا حکم دے دیا گیا چنانچہ قرآن نے اس کی اس طرح منظر کشی کی۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: ''ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ راتوں رات میرے بندوں کو (مصر سے باہر) نکال کر لے جاؤ، کیونکہ وہ تمہارا پیچھا کرنے والے ہیں''۔ [2]

---

[1] سورہ یونس آیت 87
[2] سورہ شعراء آیت 52

موسیٰ علیہ السلام نے اس حکم کی تعمیل کی اور دشمن کی نگاہوں سے بچ کر بنی اسرائیل کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کے بعد کوچ کا حکم دیا اور حکم خدا کے مطابق رات کو خصوصی طور پر منتخب کیا تا کہ یہ منصوبہ صحیح صورت میں تکمیل کو پہنچے۔

لیکن ظاہر ہے کہ اتنی بڑی تعداد کی روانگی ایسی چیز نہیں تھی جو زیادہ دیر تک چھپی رہ جاتی۔ جاسوسوں نے جلد ہی اس کی رپورٹ فرعون کو دے دی اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ''فرعون نے اپنے کارندے مختلف شہروں میں روانہ کر دیئے تا کہ فوج جمع کریں''۔[1]

البتہ اس زمانے کے حالات کے مطابق فرعون کا پیغام تمام شہروں میں پہنچانے کے لئے کافی وقت کی ضرورت تھی لیکن نزدیک کے شہروں میں یہ اطلاع بہت جلد پہنچ گئی اور پہلے سے تیار شدہ لشکر فوراً حرکت میں آ گئے اور مقدمۃ الجیش اور حملہ آور لشکر کی تشکیل کی گئی اور دوسرے لشکر بھی آہستہ آہستہ ان سے آ ملتے رہے۔

ساتھ ہی لوگوں کے حوصلے بلند رکھنے اور نفسیاتی اثر قائم رکھنے کے لئے اس نے حکم دیا کہ اس بات کا اعلان کر دیا جائے کہ ''وہ تو ایک چھوٹا سا گروہ ہے''۔[2] (تعداد کے لحاظ سے بھی کم اور طاقت کے لحاظ سے بھی کم)۔

لہٰذا اس چھوٹے سے کمزور گروہ کے مقابلے میں ہم کامیاب ہو جائیں گے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ طاقت اور قوت ہمارے پاس زیادہ ہے لہٰذا فتح بھی ہماری ہی ہوگی۔

فرعون نے یہ بھی کہا: ''آخر ہم کس حد تک برداشت کریں اور کب تک ان سرکش غلاموں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتے رہیں؟ انھوں نے تو ہمیں غصہ دلایا ہے''۔[3]

آخر کل مصر کے کھیتوں کی کون آبپاشی کرے گا؟ ہمارے گھر کون بنائے گا؟ اس وسیع و عریض مملکت کا کون لوگ بوجھ اٹھائیں گے؟ اور ہماری نوکری کون کرے گا؟

اس کے علاوہ ''ہمیں ان لوگوں کی سازشوں سے خطرہ ہے (خواہ وہ یہاں رہیں یا کہیں اور چلے جائیں) اور ہم ان سے مقابلہ کے لئے مکمل طور پر آمادہ اور اچھی طرح ہوشیار ہیں''۔[4]

3۔ پھر قرآن پاک فرعونیوں کے انجام کا ذکر کرتا ہے اور اجمالی طور پر ان کی حکومت کے زوال اور بنی اسرائیل کے اقتدار کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ''ہم نے انہیں سرسبز باغات اور پانی سے لبریز چشموں سے باہر نکال دیا''۔[5] خزانوں، خوبصورت محلات اور آرام و آسائش کے مقامات سے بھی نکال دیا۔

ہاں ہاں ہم نے ایسا ہی کیا اور بنی اسرائیل کو بغیر کسی مشقت کے یہ سب کچھ دے دیا اور انہیں فرعون والوں کا وارث بنا دیا۔[6]

خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو فرعون والوں کا وارث بنایا۔ اسی تعبیر کی بناء پر بعض مفسرین کی

---

[1] سورہ شعراء آیت 53

[2] سورہ شعراء آیت 54

[3] سورہ شعراء آیت 55

[4] سورہ شعراء آیت 56

[5] سورہ شعراء آیت 57 تا 59

[6] سورہ شعراء آیت 59۔ آیا بنی اسرائیل نے مصر میں حکومت کی ہے؟

یہ رائے ہے کہ بنی اسرائیل کے افراد مصر کی طرف واپس لوٹ آئے اور زمام حکومت واقتدار اپنے قبضے میں لے کر مدتوں وہاں حکومت کرتے رہے۔

آیات بالا کا ظاہری مفہوم بھی اسی تفسیر سے مناسبت رکھتا ہے۔

جبکہ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ وہ لوگ فرعونیوں کی ہلاکت کے بعد مقدس سرزمینوں کی طرف چلے گئے البتہ کچھ عرصے کے بعد مصر واپس آ گئے اور وہاں پر اپنی حکومت تشکیل دی۔

تفسیر کے اسی حصے کے ساتھ موجودہ توریت کی فصول بھی مطابقت رکھتی ہیں۔

بعض دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ مصر میں رہ گیا اور وہیں پر حکومت کی اور ایک گروہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سرزمین مقدس کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے وارث ہونے سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور جناب حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں مصر کی وسیع وعریض سرزمین پر حکومت کی۔

لیکن اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ انقلابی پیغمبر تھے لہٰذا یہ بات بالکل بعید نظر آتی ہے کہ وہ ایسی سرزمین کو کلی طور پر خیرباد کہہ کر چلے جائیں جس کی حکومت مکمل طور پر انہیں کے قبضہ اور اختیار میں آ چکی ہو اور وہ وہاں کے بارے میں کسی قسم کا فیصلہ کئے بغیر بیابانوں کی طرف چل دیں خصوصاً جب کہ لاکھوں بنی اسرائیلی عرصہ دراز سے وہاں پر مقیم بھی تھے اور وہاں کے ماحول سے اچھی طرح واقف بھی تھے۔

فرعونیوں کا دردناک انجام

قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی داستان کا آخری حصہ پیش کیا گیا ہے کہ فرعون اور فرعون والے کیونکر غرق ہوئے اور بنی اسرائیل نے کس طرح نجات پائی؟ جیسا کہ ہم گزشتہ میں پڑھ چکے ہیں کہ فرعون نے اپنے کارندوں کو مصر کے مختلف شہروں میں بھیج دیا تا کہ وہ بڑی تعداد میں لشکر اور افرادی قوت جمع کر سکیں چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور مفسرین کی تصریح کے مطابق فرعون نے چھ لاکھ کا لشکر مقدمۃ الجیش کی صورت میں بھیج دیا اور خود دس لاکھ کے لشکر کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

ساری رات بڑی تیزی کے ساتھ چلتے رہے اور طلوع آفتاب کے ساتھ ہی انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کے لشکر کو پالیا، چنانچہ اس سلسلے کی پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: فرعونیوں نے ان کا تعاقب کیا اور طلوع آفتاب کے وقت انہیں پالیا۔

''جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کہنے لگے اب تو ہم فرعون والوں کے نرغے میں آ گئے ہیں اور بچ نکلنے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی''۔ [1]

ہمارے سامنے دریا اور اس کی ٹھاٹھیں مارتی موجیں ہیں، ہمارے پیچھے خونخوار مسلح لشکر کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے لشکر بھی ایسے لوگوں کا ہے جو ہم سے سخت ناراض اور غصے سے بھرے ہوئے ہیں، جنھوں نے اپنی خونخواری کا ثبوت ایک طویل عرصے تک ہمارے معصوم بچوں کو قتل کر کے دیا ہے اور خود فرعون بھی بہت بڑا مغرور، ظالم اور خونخوار شخص ہے لہٰذا وہ فوراً ہمارا محاصرہ کر کے ہمیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے یا قیدی بنا کر تشدد کے ذریعے ہمیں واپس لے جائیں گے قرائن سے بھی ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا۔

---

[1] سورہ شعراء آیت 61

بنابرایں یہ کیفیت دوحال سے خالی نہیں یا تو تمام بنی اسرائیلی مصر میں واپس لوٹ آئے اور حکومت تشکیل دی، یا کچھ لوگ جناب موسیٰ علیہ السلام کے حکم کے مطابق وہیں رہ گئے تھے اور حکومت چلاتے رہے اس کے علاوہ فرعون اور فرعون والوں کے باہر نکال دینے اور بنی اسرائیل کو ان کا وارث بنا دینے کا اور کوئی واضح مفہوم نہیں ہوگا۔

اپنے عصا کو دریا پر مار دو

اس مقام پر بنی اسرائیل پر کرب و بے چینی کی حالت طاری ہوگئی اور ان کا ایک ایک لمحہ کرب واضطراب میں گزرنے لگا یہ لمحات ان کے لئے زبردست تلخ تھے شاید بہت سے لوگوں کا ایمان بھی متزلزل ہو چکا تھا اور بڑی حد تک ان کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔

لیکن جناب موسیٰ علیہ السلام حسب سابق نہایت ہی مطمئن اور پرسکون تھے انہیں یقین تھا کہ بنی اسرائیل کی نجات اور سرکش فرعونیوں کی تباہی کے بارے میں خدا کا فیصلہ اٹل ہے اور وعدہ یقینی ہے۔

لہٰذا انھوں نے مکمل اطمینان اور بھرپور اعتماد کے ساتھ بنی اسرائیل کی وحشت زدہ قوم کی طرف منہ کر کے کہا: ''ایسی کوئی بات نہیں وہ ہم پر کبھی غالب نہیں آسکیں گے کیونکہ میرا خدا میرے ساتھ ہے اور وہ بہت جلدی مجھے ہدایت کرے گا''۔ [1]

اسی موقع پر شاید بعض لوگوں نے موسیٰ کی باتوں کو سن تو لیا لیکن انہیں پھر بھی یقین نہیں آرہا تھا اور وہ اسی طرح زندگی کے آخری لمحات کے انتظار میں تھے کہ خدا کا آخری حکم صادر ہوا، قرآن کہتا ہے: ''ہم نے فوراً موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے عصا کو دریا پر مارو''۔ [2]

وہی عصا جو ایک دن تو ڈرانے کی علامت تھا اور آج رحمت اور نجات کی نشانی۔

موسیٰ علیہ السلام نے تعمیل حکم کی اور عصا فوراً دریا پر دے مارا تو اچانک ایک عجیب وغریب منظر دیکھنے میں آیا جس سے بنی اسرائیل کی آنکھیں چمک اٹھیں اور ان کے دلوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی، ناگہانی طور پر دریا پھٹ گیا، پانی کے کئی ٹکڑے بن گئے اور ہر ٹکڑا ایک عظیم پہاڑ کی مانند بن گیا اور ان کے درمیان میں راستے بن گئے۔ [3]

بہرحال جس کا فرمان ہر چیز پر جاری اور نافذ ہے اگر پانی میں طغیانی آتی ہے تو اس کے حکم سے اور اگر طوفانوں میں حرکت آتی ہے تو اس کے امر سے، وہ خدا کہ:

نقش هستی نقشی از ایوان او ست
آب و باد و خاك سر گردان او ست

اسی نے دریا کی موجوں کو حکم دیا امواج دریا نے اس حکم کو فوراً قبول کیا ایک دوسرے پر جمع ہوگئیں اور ان کے درمیان کئی راستے بن گئے اور بنی اسرائیل کے ہر گروہ نے ایک ایک راستہ اختیار کر لیا۔

فرعون اور اس کے ساتھی یہ منظر دیکھ کر حیران وششدر رہ گئے، اس قدر واضح اور آشکار معجزہ دیکھنے کے باوجود تکبر اور غرور کی

---

[1] سورہ شعراء آیت 62
[2] سورہ شعراء آیت 63
[3] سورہ شعراء آیت 63

سواری سے نہیں اترے، انھوں نے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا تعاقب جاری رکھا اور اپنے آخری انجام کی طرف آگے بڑھتے رہے جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: ''اور وہاں پر دوسرے لوگوں کو بھی ہم نے نزدیک کر دیا''۔

اس طرح فرعونی لشکر دریائی راستوں پر چل پڑے اور وہ لوگ اپنے ان پرانے غلاموں کے پیچھے دوڑتے رہے جنھوں نے اب اس غلامی کی زنجیریں توڑ دی تھیں لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ ان کی زندگی کے آخری لمحات ہیں اور ابھی عذاب کا حکم جاری ہونے والا ہے۔

قرآن کہتا ہے: ''ہم نے موسیٰ اور ان تمام لوگوں کو نجات دی جو ان کے ساتھ تھے۔''[1]

ٹھیک اس وقت جبکہ بنی اسرائیل کا آخری فرد دریا سے نکل رہا تھا اور فرعونی لشکر کا آخری فرد اس میں داخل ہو رہا تھا ہم نے پانی کو حکم دیا کہ اپنی پہلی حالت پر لوٹ ا، اچانک موجیں ٹھاٹھیں مارنے لگیں اور فرعون اور اس کے لشکر کو گھاس پھونس اور تنکوں کی طرح بہا کر لے گئیں اور صفحۂ ہستی سے ان کا نام ونشان تک مٹا دیا۔

قرآن نے ایک مختصر سی عبارت کے ساتھ یہ ماجرا یوں بیان کیا ہے: ''پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا۔''[2]

اے فرعون تیرا بدن لوگوں کے لئے عبرتناک ہوگا

بہرکیف یہ معاملہ چل رہا تھا یہاں تک کہ فرعون غرقاب ہونے لگا اور وہ عظیم دریائے نیل کی موجوں میں تنکے کی طرح غوطے کھانے لگا تو اس وقت غرور وتکبر اور جہالت وبے خبری کے پردے اس کی آنکھوں سے ہٹ گئے اور فطری نور توحید چمکنے لگا وہ پکار اٹھا: ''میں ایمان لے آیا کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں''۔[3]

کہنے لگا کہ نہ صرف میں اپنے دل سے ایمان لایا ہوں'' بلکہ عملی طور پر بھی ایسے توانا پروردگار کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں''۔[4]

درحقیقت جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشین گوئیاں یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہوئیں اور فرعون اس عظیم پیغمبر کی گفتگو کی صداقت سے آگاہ ہوا اور اس کی قدرت نمائی کا مشاہدہ کیا تو اس نے مجبوراً اظہار ایمان کیا، اسے امید تھی کہ جیسے ''بنی اسرائیل کے خدا'' نے انہیں کوہ پیکر موجوں سے نجات بخشی ہے اسے بھی نجات دے گا، لہٰذا وہ کہنے لگا میں اسی بنی اسرائیل کے خدا پر ایمان لایا ہوں، لیکن ظاہر ہے کہ ایسا ایمان جو نزول بلا اور موت کے چنگل میں گرفتار ہونے کے وقت ظاہر کیا جائے، درحقیقت ایک قسم کا اضطراری ایمان ہے، جس کا اظہار سب مجرم اور گناہگار کرتے ہیں، ایسے ایمان کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہوتی، اور نہ یہ حسن نیت اور صدق گفتار کی دلیل ہوسکتا ہے۔

اسی بنا پر خداوند عالم نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''تو اب ایمان لایا ہے حالانکہ اس سے پہلے تو نافرمانی اور طغیان کرنے والوں، مفسدین فی الارض اور تباہ کاروں کی صف میں تھا''[5]

---

[1] سورہ شعراء آیت 65

[2] سورہ شعراء آیت 66

[3] سورہ یونس آیت 90

[4] سورہ یونس آیت 90

[5] سورہ یونس آیت 90

''لیکن آج ہم تیرے بدن کو موجوں سے بچالیں گے تا کہ تو آنے والوں کے لئے درس عبرت ہو، برسر اقتدار مستکبرین کے لئے، تمام ظالموں اور مفسدوں کے لئے اور مستضعف گروہوں کے لئے بھی''۔

''بدن'' سے مراد یہاں کیا ہے؟

اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے ان میں سے اکثر کا نظریہ ہے کہ اس سے مراد فرعون کا بے جان جسم ہے کیونکہ اس ماحول کے لوگوں کے ذہن میں فرعون کی اس قدر عظمت تھی کہ اگر اس کے بدن کو پانی سے باہر نہ اچھالا جاتا تو بہت سے لوگ یقین ہی نہ کرتے کہ اس کا غرق ہونا بھی ممکن ہے اور ہوسکتا تھا کہ اس ماجرے کے بعد فرعون کی زندگی کے بارے میں افسانے تراش لئے جاتے۔

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ لغت میں لفظ ''بدن'' جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے ''جسد عظیم'' کے معنی میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے خوشحال لوگوں کی طرح کہ جنکی بڑی زرق برق افسانوی زندگی تھی وہ بڑا سخت اور چاک و چوبند تھا مگر بعض دوسرے افراد نے کہا ہے کہ ''بدن'' کا ایک معنی ''زرہ'' بھی ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا نے فرعون کو اس زریں زرہ سمیت پانی سے باہر نکالا کہ جو اس کے بدن پر تھی تا کہ اس کے ذریعے پہچانا جائے اور کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہ رہے

اب بھی مصر اور برطانیہ کے عجائب گھروں میں فرعونیوں کے مومیائی بدن موجود ہیں کیا ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہم عصر فرعون کا بدن بھی ہے کہ جسے بعد میں حفاظت کے لئے مومیا لیا گیا ہو یا نہیں؟ اس سلسلے میں کوئی صحیح دلیل ہمارے پاس نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کی گذرگاہ

قرآن مجید میں بارہا اس بات کو دہرایا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے خدا کے حکم سے بنی اسرائیل کو ''بحر'' عبور کروایا اور چند مقامات پر ''یم'' کا لفظ بھی آیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہاں پر ''یم'' ''بحر'' اور ''یم'' سے کیا مراد ہے آیا یہ نیل (NILE RIYER) جیسے وسیع وعریض دریا کی طرف اشارہ ہے کہ سرزمین مصر کی تمام آبادی جس سے سیراب ہوتی تھی یا بحیرہ احمر یعنی بحر قلزم (RID SEA) کی طرف اشارہ ہے۔

موجودہ توریت اور بعض مفسرین کے انداز گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ بحیرہ احمر کی طرف اشارہ ہے لیکن ایسے قرائن موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد نیل کا عظیم ووسیع دریا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بت سازی کی فرمائش

قرآن میں بنی اسرائیل کی سرگزشت کے ایک اور اہم حصہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ واقعہ فرعونیوں پر ان کی فتحیابی کے بعد ہوا، اس واقعہ سے بت پرستی کی جانب ان کی توجہ ظاہر ہوتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے جھگڑے سے نکل چکے تو ایک اور داخلی مصیبت شروع ہوگئی جو بنی اسرائیل کے جاہل، سرکش اور فرعون اور فرعونیوں کے ساتھ جنگ کرنے سے بدر جہا سخت اور سنگین تر تھی اور ہر داخلی کشمکش کا یہی حال ہوا کرتا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے: ''ہم نے بنی اسرائیل کو دریا (نیل) کے اس پار لگا دیا:''

لیکن ''انہوں نے راستے میں ایک قوم کو دیکھا جو اپنے بتوں کے گرد خضوع اور انکساری کے ساتھ اکٹھا تھے''۔[1] امت

---

[1] سورہ اعراف آیت 138

موسیٰ علیہ السلام کے جاہل افراد یہ منظر دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور ''وہ کہنے لگے: اے موسیٰ ہمارے واسطے بھی بالکل ویسا ہی معبود بنا دو جیسا معبود ان لوگوں کا ہے''۔[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی اس جاہلانہ اور احمقانہ فرمائش سے بہت ناراض ہوئے، آپ نے ان لوگوں سے کہا: ''تم لوگ جاہل و بے خبر قوم ہو''۔[2]

بنی اسرائیل میں ناشکر گزار افراد کی کثرت تھی، باوجودیکہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اتنے معجزے دیکھے، قدرت کے اتنے انعامات ان پر ہوئے، ان کا دشمن فرعون نابود ہوا ابھی کچھ عرصہ بھی نہیں گذرا تھا، وہ غرق کر دیا گیا اور وہ سلامتی کے ساتھ دریا کو عبور کر گئے لیکن انہوں نے ان تمام باتوں کو یکسر بھلا دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بت سازی کا سوال کر بیٹھے۔

ایک یہودی کو حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا جواب

نہج البلاغہ میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے سامنے مسلمانوں پر اعتراض کیا:

''ابھی تمہارے نبی دفن بھی نہ ہونے پائے تھے کہ تم لوگوں نے اختلاف کر دیا''۔

حضرت علی علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا:

ہم نے ان فرامین و اقوال کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو پیغمبر سے ہم تک پہنچے ہیں، پیغمبر یا ان کی نبوت سے متعلق ہم نے کوئی اختلاف نہیں کیا (چہ جائیکہ الوہیت کے متعلق ہم نے کوئی بات کہی ہو) لیکن تم (یہودی) ابھی تمہارے پیر دریا کے پانی سے خشک نہیں ہونے پائے تھے کہ تم نے اپنے نبی (حضرت موسیٰ علیہ السلام) سے یہ کہہ دیا کہ ہمارے لئے ایک ایسا ہی معبود بنا دو جس طرح کہ ان کے متعدد معبود ہیں، اور اس نبی نے تمہارے جواب میں تم سے کہا تھا کہ تم ایک ایسا گروہ ہو جو جہل کے دریا میں غوطہ زن ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی بات کی تکمیل کے لئے بنی اسرائیل سے کہا: ''اس بت پرست گروہ کو جو تم دیکھ رہے ہو ان کا انجام ہلاکت ہے اور ان کا ہر کام باطل و بے بنیاد ہے''۔[3]

اس کے بعد مزید تاکید کے لئے فرمایا گیا ہے: ''آیا خدائے برحق کے علاوہ تمہارے لئے کوئی دوسرا معبود بنا لوں، وہی خدا جس نے اہل جہان (ہمعصر لوگوں) پر تم کو فضیلت دی''۔[4]

اس کے بعد خداوند کریم اپنی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت کا ذکر فرماتا ہے جو اس نے بنی اسرائیل کو عطا فرمائی تھی تاکہ اس عظیم نعمت کا تصور کر کے ان میں شکر گزاری کا جذبہ بیدار ہو اور انہیں یہ احساس ہو کہ پرستش اور سجدے کا مستحق صرف خدائے یکتا و یگانہ ہے، اور اس بات کی کوئی دلیل نہیں پائی جاتی کہ جو بت بے نفع اور بے ضرر ہیں ان کے سامنے سر تعظیم جھکایا جائے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ''یاد کرو اس وقت کو جب کہ ہم نے تمہیں فرعون کے گروہ کے شر سے نجات دیدی، وہ لوگ تم کو مسلسل عذاب دیتے چلے آ رہے تھے''۔[5]

اس کے بعد اس عذاب و ایذا رسانی کی تفصیل یوں بیان فرماتا ہے: ''وہ تمہارے بیٹوں کو تو قتل کر دیتے تھے اور تمہاری

---

[1] سورہ اعراف آیت 138

[2] سورہ اعراف آیت 138

[3] سورہ اعراف آیت 139

[4] سورہ اعراف آیت 140

[5] سورہ اعراف آیت 141

عورتوں لڑکیوں کو (خدمت اور کنیزی کے لئے) زندہ چھوڑ دیتے تھے''۔ [1]

بنی اسرائیل سرزمین مقدس کی طرف

قرآن میں اس کے بعد سرزمین مقدس میں بنی اسرائیل کے ورود کے بارے میں یوں بیان کیا گیا ہے: ''موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ تم سرزمین مقدس میں جسے خدا نے تمہارے لئے مقرر کیا ہے۔ داخل ہو جاؤ، اس سلسلے میں مشکلات سے نہ ڈرو، فدا کاری سے منہ نہ موڑو اور اگر تم نے اس حکم سے پیٹھ پھیری تو خسارے میں رہو گے''۔ [2]

ارض مقدسہ سے کیا مراد ہے اس سلسلے میں مفسرین نے بہت کچھ کہا ہے، بعض بیت المقدس کہتے ہیں کچھ اردن یا فلسطین کا نام لیتے ہیں اور بعض سرزمین طور سمجھتے ہیں، لیکن بعید نہیں کہ اس سے مراد منطقہ شامات ہو، جس میں تمام مذکورہ علاقے شامل ہیں۔

کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ یہ سارا علاقہ انبیاء الٰہی کا گہوارہ، عظیم ادیان کے ظہور کی زمین اور طول تاریخ میں توحید، خدا پرستی اور تعلیمات انبیاء کی نشر و اشاعت کا مرکز رہا ہے۔

لہٰذا اسے سرزمین مقدس کہا گیا ہے اگر چہ بعض اوقات خاص بیت المقدس کو بھی ارض مقدس کہا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل نے اس حکم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہی جواب دیا جو ایسے موقع پر کمزور، بزدل اور جاہل لوگ دیا کرتے ہیں۔

ایسے لوگ چاہتے ہیں کہ تمام کامیابیاں انہیں اتفاقاً اور معجزانہ طور پر ہی حاصل ہو جائیں یعنی لقمہ بھی کوئی اٹھا کر ان کے منہ میں ڈال دے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے: ''آپ جانتے ہیں کہ اس علاقے میں ایک جابر اور جنگجو گروہ رہتا ہے جب تک وہ اسے خالی کر کے باہر نہ چلا جائے ہم تو اس علاقے میں قدم تک نہیں رکھیں گے اسی صورت میں ہم آپ کی اطاعت کریں گے اور سرزمین مقدس میں داخل ہوں گے''۔ [3]

بنی اسرائیل کا یہ جواب اچھی طرح نشاندہی کرتا ہے کہ طویل فرعونی استعمار نے ان کی نسلوں پر کیسا اثر چھوڑا تھا لفظ ''لن'' جو دائمی طور پر دلالت کرتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ سرزمین مقدس کی آزادی کے لئے مقابلے سے کس قدر خوف زدہ تھے۔

چاہئے تو یہ تھا کہ بنی اسرائیل سعی و کوشش کرتے، جہاد و قربانی کے جذبے سے کام اور سرزمین مقدس پر قبضہ کر لیتے اگر فرض کریں کہ سنت الٰہی کے برخلاف بغیر کسی اقدام کے ان کے تمام دشمن معجزانہ طور پر نابود ہو جاتے اور بغیر کوئی تکلیف اٹھائے وہ وسیع علاقے کے وارث بن جاتے تو اس کا نظام چلانے اور اس کی حفاظت میں بھی ناکام رہتے بغیر زحمت سے حاصل کی ہوئی چیز کی حفاظت سے انہیں کیا سروکار ہو سکتا تھا نہ وہ اس کے لئے تیار ہوتے اور نہ اہل۔

جیسا کہ تواریخ سے ظاہر ہوتا ہے آیت میں قوم جبار سے مراد قوم ''عمالقہ'' ہے یہ لوگ سخت جان اور بلند قامت تھے یہاں تک کہ ان کی بلند قامت کے بارے میں بہت مبالغے ہوئے اور افسانے تراشے گئے اس سلسلے میں مضحکہ خیز باتیں گھڑی گئیں جن کے لئے کوئی عملی دلیل نہیں ہے۔ [4]

---

[1] سورہ اعراف آیت 141

[2] سورہ مائدہ آیت 21

[3] سورہ مائدہ آیت 22

[4] خصوصاً ''عوج'' کے بارے میں خرافات سے معمور ایسی کہانیاں تاریخوں میں ملتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے افسانے جن میں سے بعض اسلامی کتب میں بھی آ گئے ہیں، دراصل بنی اسرائیل کے گھڑے ہوئے ہیں انہیں عام طور پر ''اسرائیلیات'' کہا جاتا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ خود موجودہ توریت کے متن میں ایسے افسانے دکھائی دیتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: ''اس وقت اہل ایمان میں سے دو افراد ایسے تھے جن کے دل میں خوف خدا تھا اور اس بنا پر انہیں عظیم نعمتیں میسر تھیں ان میں استقامت وشجاعت بھی تھی، وہ دور اندیش بھی تھے اور اجتماعی اور فوجی نقطۂ نظر سے بھی بصیرت رکھتے تھے انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دفاعی تجویز کی حمایت کی اور بنی اسرائیل سے کہنے لگے: تم شہر کے دروازے سے داخل ہو جاؤ اور اگر تم داخل ہو گئے تو کامیاب ہو جاؤ گے''۔

لیکن ہر صورت میں تمہیں روح ایمان سے مدد حاصل کرنا چاہئے اور خدا پر بھروسہ کرو تا کہ اس مقصد کو پالو۔ [1]

اس بارے میں کہ یہ دو آدمی کون تھے؟ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ ''یوشع بن نون'' اور ''کالب بن یوفنا'' (''یفنہ'' بھی لکھتے ہیں) تھے جو بنی اسرائیل کے نقیبوں میں سے تھے۔

جب کامیاب ہو جاؤ تو ہمیں بھی خبر کرنا

بنی اسرائیل نے یہ تجویز قبول نہ کی اور ضعف وکمزوری جو ان کی روح پر قبضہ کر چکی تھی، کے باعث انھوں نے صراحت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ''جب تک وہ لوگ اس سرزمین میں ہیں ہم ہرگز داخل نہیں ہوں گے، تم اور تمہارا پروردگار جس نے تم سے کامیابی کا وعدہ کیا ہے، جاؤ اور عمالقہ سے جنگ کرو اور جب کامیاب ہو جاؤ تو ہمیں بتا دینا ہم یہیں بیٹھے ہیں''۔ [2]

بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبر کے ساتھ جسارت کی انتہا کر دی تھی، کیونکہ پہلے تو انھوں نے لفظ ''لن'' اور ''ابداً'' استعمال کر کے اپنی صریح مخالفت کا اظہار کیا اور پھر یہ کہا کہ تم اور تمہارا پروردگار جاؤ اور جنگ کرو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں، انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے وعدوں کی، تحقیر کی یہاں تک کہ خدا کے ان دو بندوں کی تجویز کی بھی پرواہ نہیں کی اور شاید انہیں تو کوئی مختصر سا جواب تک نہیں دیا۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ موجودہ توریت سفر اعداد باب 14 میں بھی اس داستان کے بعض اہم حصے موجود ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان لوگوں سے بالکل مایوس ہو گئے اور انھوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے اور ان سے علیحدگی کے لئے یوں تقاضا کیا: ''پروردگار میرا تو صرف اپنے آپ پر اور اپنے بھائی پر بس چلتا ہے: خدایا ہمارے اور اس فاسق وسرکش گروہ میں جدائی ڈال دے''۔ [3]

بنی اسرائیل بیابان میں سرگرداں

آخر کار حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی اور بنی اسرائیل اپنے ان برے اعمال کے انجام سے دوچار ہوئے خدا کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی ہوئی: ''یہ لوگ اس مقدس سرزمین سے چالیس سال تک محروم رہیں گے جو طرح طرح کی مادی اور روحانی نعمات سے مالا مال ہے''۔ [4]

علاوہ ازیں ان چالیس سالوں میں انہیں اس بیابان میں سرگرداں رہنا ہوگا اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا ہے:

---

[1] سورہ مائدہ آیت 23

[2] سورہ مائدہ آیت 24

[3] سورہ مائدہ آیت 25

[4] سورہ مائدہ آیت 26

''اس قوم کے سر پر جو کچھ بھی آئے وہ صحیح ہے، ان کے اس انجام پر کبھی غمگین نہ ہونا''۔[1]

آخری جملہ شاید اس لئے ہو کہ جب بنی اسرائیل کے لئے یہ فرمان صادر ہوا کہ وہ چالیس سال تک سزا کے طور پر بیابان میں سرگرداں رہیں گے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں جذبہ مہربانی پیدا ہوا ہو اور شاید انھوں نے درگاہ خداوندی میں ان کے لئے عفو و درگذر کی درخواست بھی کی ہو جیسا کہ موجودہ توریت میں بھی ہے۔

لیکن انہیں فوراً جواب دیا گیا کہ وہ اس سزا کے مستحق ہیں نہ کہ عفو و درگذر کے، کیونکہ جیسا کہ قرآن میں ہے کہ وہ فاسق اور سرکش لوگ تھے اور جو ایسے ہوں ان کے لئے یہ انجام حتمی ہے۔

توجہ رہے کہ ان کے لئے چالیس سال کی یہ محرومیت انتقامی جذبے سے نہ تھی (جیسا کہ خدا کی طرف سے کوئی سزا بھی ایسی نہیں ہوتی بلکہ وہ یا اصلاح کے لئے ہوتی ہے اور یا عمل کا نتیجہ) درحقیقت اس کا ایک فلسفہ تھا اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل ایک طویل عرصے تک فرعونی استعمار کی ضربیں جھیل چکے تھے، اس عرصے میں حقارت آمیز رسومات، اپنے مقام کی عدم شناخت اور احساسات ذلت کا شکار ہو چکے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے عظیم رہبر کی سرپرستی میں اس تھوڑے سے عرصے میں اپنی روح کو ان خامیوں سے پاک نہیں کر سکے تھے اور وہ ایک ہی جست میں افتخار، قدرت اور سربلندی کی نئی زندگی کے لئے تیار نہیں ہو پائے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں مقدس سرزمین کے حصول کے لئے جہاد آزادی کا جو حکم دیا تھا اس پر عمل نہ کرنے کے لئے انھوں نے جو کچھ کہا وہ اس حقیقت کی واضح دلیل ہے لہٰذا ضروری تھا کہ وہ ایک طویل مدت وسیع بیابانوں میں سرگرداں رہیں اور اس طرح ان کی ناتواں اور غلامانہ ذہنیت کی حامل موجودہ کمزور نسل آہستہ آہستہ ختم ہو جائے اور نئی نسل حریت و آزادی کے ماحول میں اور خدائی تعلیمات کی آغوش میں پروان چڑھے تا کہ وہ اس قسم کے جہاد کے لئے اقدام کر سکے اور اس طرح سے اس سرزمین پر حق کی حکمرانی قائم ہو سکے۔

بنی اسرائیل کا ایک گروہ پشیمان ہوا

بنی اسرائیل کا ایک گروہ اپنے کئے پر سخت پشیمان ہوا۔ انہوں نے بارگاہ خدا کا رخ کیا۔ خدا نے دوسری مرتبہ بنی اسرائیل کو اپنی نعمتوں سے نوازا جن میں سے بعض کی طرف قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے۔

''ہم نے تمہارے سر پر بادل سے سایہ کیا''۔[2] سرخط وہ مسافر جو صبح سے غروب تک سورج کی گرمی میں بیابان میں چلتا ہے وہ ایک لطیف سائے سے کیسی راحت پائے گا (وہ سایہ جو بادل کا ہو جس سے انسان کے لئے نہ تو فضا محدود ہوتی ہو اور نہ جو ہوا چلنے سے مانع ہو)۔

یہ صحیح ہے کہ بادل کے سایہ فگن ٹکڑوں کا احتمال ہمیشہ بیابان میں ہوتا ہے لیکن قرآن واضح طور پر کہہ رہا ہے کہ بنی اسرئیل کے ساتھ ایسا عام حالات کی طرح نہ تھا بلکہ وہ لطف خدا سے اکثر اس عظیم نعمت سے بہرہ ور ہوتے تھے۔

دوسری طرف اس خشک اور جلا دینے والے بیابان میں چالیس سال کی طویل مدت سرگرداں رہنے والوں کے لئے غذا کی کافی و وافی ضرورت تھی، اس مشکل کو بھی خداوند عالم نے ان کے لئے حل کر دیا، جیسا کہ اشاد ہوتا ہے: ہم نے ''من وسلوی'' جو لذیذ اور

---

[1] سورہ مائدہ آیت 26

[2] سورہ بقرہ آیت 57

طاقت بخش غذا ہے تم پر نازل کیا۔

ان پاکیزہ غذاؤں سے جو تمہیں روزی کے طور پر دی گئی ہیں کھاؤ (اور حکم خدا کی نافرمانی نہ کرو اور اس کی نعمت کا شکر ادا کرو۔)

لیکن وہ پھر بھی شکر گزاری کے دروازے میں داخل نہیں ہوئے (تاہم) ''انہوں نے ہم پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ اپنے اوپر ہی ظلم کیا ہے''۔[1]

منّ وسلویٰ کیا ہے؟

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ایک روایت کے مطابق، آپ نے فرمایا:

''کھمبی کی قسم کی ایک چیز تھی جو اس زمین میں اُگتی تھی''۔ پس معلوم ہوا کہ ''منّ'' ایک ''قارچ'' تھی جو اس علاقہ میں پیدا ہوتی تھی۔[2]

ایک احتمال اور بھی ہے کہ بنی اسرائیل کی سرگردانی کے زمانے میں خدا کے لطف وکرم سے جو نفع بخش بارشیں برستی تھیں ان کے نتیجے میں درختوں سے کوئی خاص قسم کی گوند اور شیرہ نکلتا تھا اور بنی اسرائیل اس سے مستفید ہوتے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ ''منّ'' سے مراد وہ تمام نعمتیں جو خدا نے بنی اسرائیل کو عطا فرمائی تھیں اور ''سلویٰ'' وہ تمام عطیات ہیں جو ان کی راحت وآرام اور اطمینان کا سبب تھے۔

''سلویٰ'' اگرچہ بعض مفسرین نے اسے شہد کے ہم معنی لیا ہے لیکن دوسرے تقریباً سب مفسرین نے اسے پرندے کی ایک قسم قرار دیا ہے۔ یہ پرندہ اطراف اور مختلف علاقوں سے کثرت سے اس علاقے میں آتا تھا اور بنی اسرائیل اس کے گوشت سے استفادہ کرتے تھے۔ عہدین پر لکھی گئی تفسیر میں بھی اس نظریہ کی تائید دکھائی دیتی ہے۔[3]

البتہ بنی اسرائیل کی سرگردانی کے دنوں میں ان پر خدا کا یہ خاص لطف وکرم تھا کہ یہ پرندہ وہاں کثرت سے ہوتا تھا تاکہ وہ اس سے استفادہ کرسکیں۔ ورنہ تو عام حالات میں اس طرح کی نعمت کا وجود مشکل تھا۔

بعض دیگر حضرات کے نزدیک ''منّ'' ایک قسم کا طبیعی شہد ہے اور بنی اسرائیل اس بیابان میں طویل مدت تک چلتے پھرتے رہنے سے شہد کے مخزنوں تک پہنچ جاتے تھے کیونکہ ''بیابان تیہ'' کے کناروں پر پہاڑ اور سنگلاخ علاقہ تھا جس میں کافی طبیعی شہد نظر آجاتا تھا۔

عہدین (توریت اور انجیل) پر لکھی گئی تفسیر سے اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے جس میں ہے کہ مقدس سرزمین قسم قسم کے پھولوں اور شگوفوں کی وجہ سے مشہور ہے اسی لئے شہد کی مکھیوں کے جتھے ہمیشہ پتھروں کے سوراخوں، درختوں کی شاخوں اور لوگوں کے

---

[1] سورہ بقرہ آیت 57

[2] توریت میں ہے کہ ''منّ'' دھنیے کے دانوں جیسی کوئی چیز ہے جو رات کو اس سرزمین پر آگرتی تھی، بنی اسرائیل اسے اکٹھا کرکے پیس لیتے اور اس سے روٹی پکاتے تھے جس کا ذائقہ روغنی روٹی جیسا ہوتا تھا۔

[3] اس میں لکھا ہے معلوم ہونا چاہیے کہ بہت بڑی تعداد میں سلویٰ افریقہ سے چل کے شمال کو جاتے ہیں۔ ''جزیرہ کاپری'' میں ایک فصل میں 16 ہزار کی تعداد میں ان کا شکار کیا گیا۔ یہ پرندہ بحیرہ قلزم کے راستے سے آتا ہے۔ خلیج عقبہ اور سویز کو عبور کرتا ہے۔ ہفتے کو جزیرہ سینا میں داخل ہوتا ہے اور راستے میں اس قدر تکان وتکلیف جھیلنے کی وجہ سے آسانی سے ہاتھ سے پکڑا جاسکتا ہے اور جب پرواز کرتا ہے تو زمین کے قریب ہوتا ہے۔ اس حصے کے متعلق (توریت کے) سفر خروج اور سفر اعداد میں گفتگو ہوئی ہے۔

گھروں پر جا بیٹھتے ہیں اس طرح سے بہت فقیر و مسکین لوگ بھی شہد کھا سکتے تھے۔

اس تحریر سے بھی واضح ہوتا ہے کہ سلویٰ سے مراد وہی پر گوشت پرندہ ہے جو کبوتر کے مشابہ اور اس کے ہم وزن ہوتا ہے اور یہ پرندہ اس سرزمین میں مشہور ہے۔

بیابانوں میں چشمہ ابلنا

بنی اسرائیل پر کی گئی ایک اور نعمت کی نشاندہی کرتے ہوئے اللہ فرماتا ہے: ''یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ علیہ السلام نے (اس خشک اور جلانے والے بیابان میں جس وقت بنی اسرائیل پانی کی وجہ سے سخت تنگی میں مبتلا تھے) پانی کی درخواست کی''۔[1] تو خدا نے اس درخواست کو قبول کیا جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ہم نے اسے حکم دیا کہ اپنا عصا مخصوص پتھر پر مارو اس سے اچانک پانی نکلنے لگا اور پانی کے بارہ چشمے زور و شور سے جاری ہو گئے۔[2] بنی اسرائیل کے قبائل کی تعداد کے عین مطابق جب یہ چشمے جاری ہوئے تو ایک چشمہ ایک قبیلے کی طرف جھک جاتا تھا جس پر بنی اسرائیل کے لوگوں ''اور قبیلوں میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے چشمے کو پہچان لیا''۔[3]

یہ پتھر کس قسم کا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کس طرح اس پر عصا مارتے تھے اور پانی اس میں سے کیسے جاری ہو جاتا تھا۔ اس سلسلے میں بہت کچھ گفتگو کی گئی ہے۔ قرآن جو کچھ اس بارے میں کہتا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس پر عصا مارا تو اس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ پتھر ایک کوہستانی علاقے کے ایک حصے میں واقع تھا جو اس بیابان کی طرف جھکا ہوا تھا۔ سورہ اعراف آیہ 160 کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ابتداء میں اس پتھر سے تھوڑا تھوڑا پانی نکلا، بعد میں زیادہ ہو گیا، یہاں تک کہ بنی اسرائیل کا ہر قبیلہ ان کے جانور جوان کے ساتھ تھے اور وہ کھیتی جو انہوں نے احتمالاً اس بیابان کے ایک حصے میں تیار کی تھی سب اس سے سیراب ہو گئے، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کوہستانی علاقے میں پتھر کے ایک حصے سے پانی جاری ہوا البتہ یہ مسلم ہے کہ یہ سب معجزے سے رونما ہوا۔[4]

''خدا نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: قوم کے آگے آگے رہو اور اسرائیل کے بعض بزرگوں کو ساتھ لے لو اور وہ عصا جسے نہر پر مارا تھا ہاتھ میں لے کر روانہ ہو جاؤ۔ میں وہاں تمہارے سامنے کوہ حوریب پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ اور اسے پتھر پر مارو، اس سے پانی جاری ہو جائے گا، تا کہ قوم پی لے اور موسیٰ علیہ السلام نے اسرائیل کے مشائخ اور بزرگوں کے سامنے ایسا ہی کیا''۔

بہر حال ایک طرف خداوند عالم نے ان پر من و سلویٰ نازل کیا اور دوسری طرف انہیں فراوان پانی عطا کیا اور ان سے فرمایا: ''خدا کی دی ہوئی روزی سے کھاؤ پیو لیکن زمین میں خرابی اور فساد نہ کرو''۔[5]

گویا انہیں متوجہ کیا گیا ہے کہ کم از کم ان عظیم نعمتوں کی شکر گزاری کے طور پر ضدی پن، ستمگری، انبیاء کی ایذا رسانی اور بہانہ بازی ترک کر دو۔

---

[1] سورہ بقرہ آیت 60

[2] سورہ بقرہ آیت 60

[3] سورہ بقرہ آیت 60

[4] توریت کی سترھویں فصل میں سفر خروج کے ذیل میں بھی یوں لکھا ہے۔

[5] سورہ بقرہ آیت 60

مختلف کھانوں کی تمنا

ان نعمات فراوان کی تفصیل کے بعد جن سے خدا نے بنی اسرائیل کو نوازا تھا۔ قرآن میں ان عظیم نعمتوں پر ان کے کفران اور ناشکر گزاری کی حالت کو منعکس کیا گیا ہے۔ اس میں اس بات کی نشاندہی ہے کہ وہ کس قسم کے ہٹ دھرم لوگ تھے۔ شاید تاریخ دنیا میں ایسی کوئی مثال نہ ملے گی کہ کچھ لوگوں پر اس طرح سے الطاف الٰہی ہو لیکن انہوں نے اس طرح سے اس کے مقابلے میں ناشکری اور نافرمانی کی ہو۔

پہلے فرمایا گیا ہے:

''یاد کرو اس وقت کو جب تم نے کہا: اے موسیٰ ہم سے ہرگز یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک ہی غذا پر قناعت کرلیں، (من وسلویٰ کتنی ہی لذیذ غذا ہو، ہم مختلف قسم کی غذا چاہتے ہیں''۔ [1]

''لہٰذا خدا سے خواہش کرو کہ وہ زمین سے جو کچھ اگایا کرتا ہے ہمارے لئے بھی اگائے سبزیوں میں سے، ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز''۔ [2]

لیکن موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: ''کیا تم بہتر کے بجائے پست تر غذا پسند کرتے ہو''۔ [3]

''جب معاملہ ایسا ہی ہے تو پھر اس بیابان سے نکلو اور کسی شہر میں داخل ہونے کی کوشش کرو کیونکہ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ وہاں ہے''۔ [4]

یعنی تم لوگ اس وقت اس بیابان میں خودسازی اور امتحان کی منزل میں ہو، یہاں مختلف کھانے نہیں مل سکتے، جاؤ شہر میں جاؤ تاکہ یہ چیزیں تمہیں مل جائیں، لیکن یہ خودسازی کا پروگرام وہاں نہیں ہے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے کہ خدا نے ان کی پیشانی پر ذلت وفقر کی مہر لگادی اور وہ دوبارہ غضب الٰہی میں گرفتار ہوگئے۔

یہ اس لئے ہوا کہ وہ آیات الٰہی کا انکار کرتے تھے اور ناحق انبیاء کو قتل کرتے تھے۔ یہ سب اس لئے تھا کہ وہ گناہ، سرکشی اور تجاوز کے مرتکب ہوتے تھے۔ [5]

عظیم وعدہ گاہ

قرآن میں بنی اسرائیل کی زندگی کا ایک اور منظر بیان کیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم سے جھگڑنا پڑا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خدا کے مقام وعدہ پر جانا، وحی کے ذریعے احکام توریت لینا، خدا سے باتیں کرنا، کچھ بزرگان بنی اسرائیل کو میعادگاہ میں ان واقعات کے مشاہدہ کے لئے لانا، اس بات کا اظہار ہے کہ خدا کو ان آنکھوں سے ہرگز نہیں دیکھا جاسکتا۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ''ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں (پورے ایک مہینہ) کا وعدہ کیا، اس کے بعد مزید دس راتیں بڑھا کر اس

---

[1] سورہ بقرہ آیت 61

[2] سورہ بقرہ آیت 61

[3] سورہ بقرہ آیت 61

[4] سورہ بقرہ آیت 61

[5] سورہ بقرہ آیت 61

وعدہ کی تکمیل کی، چنانچہ موسیٰ سے خدا کا وعدہ چالیس راتوں میں پورا ہوا''۔[1]

اس کے بعد اس طرح بیان کیا گیا ہے: ''موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا: میری قوم میں تم میرے جانشین بن جاؤ اور ان کی اصلاح کی کوشش کرو اور کبھی مفسدوں کی پیروی نہ کرنا''۔[2]

مفسرین کے درمیان اس تفریق کے بارے میں بحث ہے، لیکن جو بات بیشتر قرین قیاس ہے،

دیدار پروردگار کی خواہش

قرآن میں بنی اسرائیل کی زندگی کے بعض دیگر مناظر پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے اصرار کے ساتھ یہ خواہش کی کہ وہ خدا کو دیکھیں گے۔ اگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو وہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔

اہل بیت علیہم السلام کے بھی موافق ہے وہ یہ ہے کہ یہ میعاد اگر چہ واقع میں چالیس راتوں کا تھا لیکن خدا نے بنی اسرائیل کی آزمائش کرنے کے لئے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو تیس راتوں کی دعوت دی پھر اس کے بعد اس کی تجدید کر دی تا کہ منافقین مومنین سے الگ ہو جائیں۔ اس سلسلے میں امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام وعدہ گاہ الٰہی کی طرف گئے تو انہوں نے بنی اسرائیل سے یہ کہہ رکھا تھا کہ ان کی غیبت تیس روز سے زیادہ طولانی نہ ہوگی لیکن جب خدا نے اس پر دس دنوں کا اضافہ کر دیا تو بنی اسرائیل نے کہا: موسیٰ علیہ السلام نے اپنا وعدہ توڑ دیا اس کے نتیجہ میں انہوں نے وہ کام کئے جو ہم جانتے ہیں (یعنی گوسالہ پرستی میں مبتلا ہو گئے)۔

رہا یہ سوال کہ یہ چالیس روز یا چالیس راتیں، اسلامی مہینوں میں سے کونسا زمانہ تھا؟ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدت ذیقعدہ کی پہلی تاریخ سے لے کر ذی الحجہ کی دس تاریخ تک تھی۔ قرآن میں چالیس راتوں کا ذکر ہے نہ کہ چالیس دنوں کا۔ تو شاید اس وجہ سے ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اپنے رب سے جو مناجاتیں تھیں وہ زیادہ تر رات ہی کے وقت ہوا کرتی تھیں۔

اس کے بعد ایک اور سوال سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کس طرح اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے کہا کہ قوم کی اصلاح کی کوشش کرنا اور مفسدوں کی پیروی نہ کرنا، جبکہ حضرت ہارون علیہ السلام ایک نبی برحق اور معصوم تھے وہ بھلا مفسدوں کی پیروی کیوں کرنے لگے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ: یہ درحقیقت اس بات کی تاکید کے لئے تھا کہ حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنی قوم میں اپنے مقام کی اہمیت کا احساس رہے اور شاید اس طرح سے خود بنی اسرائیل کو بھی اس بات کا احساس دلانا چاہتے تھے کہ وہ ان کی غیبت میں حضرت ہارون علیہ السلام کی رہنمائی کا اچھی طرح اثر لیں اور ان کا کہنا مانیں اور ان کے اوامر و نواہی (احکامات) کو اپنے لئے سخت نہ سمجھیں، اس سے اپنی تحقیر خیال نہ کریں اور انکے سامنے اس طرح مطیع و فرمانبردار رہیں جس طرح وہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرمانبردار تھے۔

---

[1] سورہ اعراف آیت 142

[2] سورہ اعراف آیت 143

پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے پہلے ہی سے چالیس راتوں کا وعدہ کیوں نہ کیا بلکہ پہلے تیس راتوں کا وعدہ کیا اس کے بعد دس راتوں کا اور اضافہ کر دیا۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے ستر آدمیوں کا انتخاب کیا اور انہیں اپنے ہمراہ پروردگار کی میعادگاہ کی طرف لے گئے، وہاں پہنچ کر ان لوگوں کی درخواست کو خدا کی بارگاہ میں پیش کیا۔ خدا کی طرف سے اس کا ایسا جواب ملا جس سے بنی اسرائیل کے لئے یہ بات اچھی طرح سے واضح ہوگئی۔

ارشاد ہوتا ہے: ''جس وقت موسیٰ ہماری میعادگاہ میں آئے اور ان کے پروردگار نے ان سے باتیں کیں تو انہوں نے کہا: اے پروردگار خود کو مجھے دکھلا دے تا کہ میں تجھے دیکھ لوں''۔ [1]

لیکن موسیٰ علیہ السلام نے فوراً خدا کی طرف سے یہ جواب سنا: تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے۔

لیکن پہاڑ کی جانب نظر کرو اگر وہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تب مجھے دیکھ سکو گے۔

جس وقت خدا نے پہاڑ پر جلوہ کیا تو اسے فنا کر دیا اور اسے زمین کے برابر کر دیا۔

موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ ہولناک منظر دیکھا تو ایسا اضطراب لاحق ہوا کہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ اور جب ہوش میں آئے تو خدا کی بارگاہ میں عرض کی پروردگارا تو منزہ ہے، میں تیری طرف پلٹتا ہوں، اور توبہ کرتا ہوں اور میں پہلا ہوں مومنین میں سے۔ [2]

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رویت کی خواہش کیوں کی؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم نبی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ذات خداوندی قابل دید نہیں ہے کیونکہ نہ تو وہ جسم ہے، نہ اس کے لئے کوئی مکان و جہت ہے اس کے باوجود انہوں نے ایسی خواہش کیسے کر دی جو فی الحقیقت ایک عام انسان کی شان کے لئے بھی مناسب نہیں ہے؟

سب سے واضح جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ خواہش دراصل اپنی قوم کی طرف سے کی تھی کیونکہ بنی اسرائیل کے جہلاء کے ایک گروہ کا یہ اصرار تھا کہ وہ خدا کو کھلم کھلا دیکھیں گے تب ایمان لائیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کی جانب سے یہ حکم ملا کہ وہ اس درخواست کو خدا کی بارگاہ میں پیش کریں تا کہ سب اس کا جواب سن لیں، کتاب عیون اخبار الرضا میں امام رضا علیہ السلام سے جو حدیث مروی ہے وہ بھی اس مطلب کی تائید کرتی ہے۔ [3]

---

[1] سورہ اعراف آیت 143

[2] سورہ اعراف آیت 143

[3] حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کس چیز سے توبہ کی؟ اس بارے میں جو سوال سامنے آتا ہے یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوش میں آئے تو انہوں نے کیوں کہا: ''میں توبہ کرتا ہوں'' حالانکہ انہوں نے کوئی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ کیونکہ اگر انہوں نے یہ درخواست اپنی امت کی طرف سے کی تھی تو اس میں ان کا کیا قصور تھا، اللہ کی اجازت سے انہوں نے یہ درخواست خدا کے سامنے پیش کی اور اگر اپنے لئے شہود باطنی کی تمنا کی تھی تو یہ بھی خدا کے حکم کی مخالفت نہ تھی، لہٰذا توبہ کس بات کی تھی؟ دو طرح سے اس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے:

اول: یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی نمائندگی کے طور پر خدا سے یہ سوال کیا تھا، اس کے بعد جب خدا کی طرف سے سخت جواب ملا جس میں اس سوال کی غلطی کو بتلایا گیا تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توبہ بھی انہیں کی طرف سے کی تھی۔

دوم: یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اگرچہ یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کی درخواست کو پیش کریں لیکن جس وقت پروردگار کی تجلی کا واقعہ رونما ہوا اور حقیقت آشکار ہوگئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ ماموریت ختم ہو چکی تھی اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چاہئے یہ پہلی حالت (یعنی قبل از ماموریت) کی طرف پلٹ جائیں اور اپنے ایمان کا اظہار کریں تا کہ کسی کے لئے جائے شبہ باقی نہ رہے، لہٰذا اس حالت کا اظہار موسیٰ علیہ السلام نے اپنی توبہ اور اس جملہ "انی تبت الیك وانا اول المومنین" سے کیا۔

الواح توریت

آخر کار اس عظیم میعادگاہ میں اللہ نے موسیٰ علیہ السلام پر اپنی شریعت کے قوانین نازل فرمائے۔ پہلے ان سے فرمایا: ''اے موسیٰ میں نے تمہیں لوگوں پر منتخب کیا ہے، اور تم کو اپنی رسالتیں دی ہیں، اور تم کو اپنے ساتھ گفتگو کا شرف عطا کیا ہے''۔ [1]

اب جبکہ ایسا ہے تو ''جو میں نے تم کو حکم دیا ہے اسے لے لو اور ہمارے اس عطیہ پر شکر کرنے والوں میں سے ہو جاؤ''۔ [2]

اس کے بعد اضافہ کیا گیا ہے کہ ہم نے جو الواح موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی تھیں ان پر ہر موضوع کے بارے میں کافی نصیحتیں تھیں اور ضرورت کے مسائل کی شرح اور بیان تھا۔

اس کے بعد ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ ''بڑی توجہ اور قوت ارادی کے ساتھ ان فرامین کو اختیار کرو۔'' [3] اور اپنی قوم کو بھی حکم دو کہ ان میں جو بہترین ہیں انہیں اختیار کریں۔

اور انہیں خبردار کر دو کہ ان فرامین کی مخالفت اور ان کی اطاعت سے فرار کرنے کا نتیجہ دردناک ہے اور اس کا انجام دوزخ ہے اور ''میں جلد ہی فاسقوں کی جگہ تمہیں دکھلا دوں گا۔'' [4]

یہودیوں میں گوسالہ پرستی کا آغاز

قرآن میں افسوس ناک اور تعجب خیز واقعات میں سے ایک واقعہ کا ذکر ہوا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے میقات کی طرف جانے کے بعد بنی اسرائیل میں رونما ہوا۔ وہ واقعہ ان لوگوں کی گوسالہ پرستی ہے۔ جو ایک شخص بنام ''سامری'' نے زیور و آلات بنی اسرائیل کے ذریعے شروع کیا۔

سامری کو چونکہ اس بات کا احساس تھا کہ قوم موسیٰ علیہ السلام عرصہ دراز محرومی اور مظلومی کی زندگی بسر کر رہی تھی اس وجہ سے اس میں مادہ پرستی پائی جاتی تھی اور حب زر کا جذبہ بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔ جیسا کہ آج بھی ان کی یہی صفت ہے لہٰذا اس نے یہ چالاکی کی کہ وہ

---

[1] سورہ اعراف آیت 144

[2] سورہ اعراف آیت 144

[3] سورہ اعراف آیت 145

[4] سورہ اعراف آیت 145

یہاں پر دو چیزوں کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے:

1۔ الواح کس چیز کی بنی ہوئی تھیں: اس آیت کا ظاہر یہ ہے کہ خداوند کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو الواح نازل کی تھیں ان میں توریت کی شریعت اور قوانین لکھے ہوئے تھے، ایسا نہ تھا کہ یہ لوحیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں تھیں اور اس میں فرامین منعکس ہو گئے تھے۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ لوحیں کیسی تھیں؟ کس چیز کی بنی ہوئی تھیں؟ قرآن نے اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے صرف کلمہ ''الواح'' سربستہ طور پر آیا ہے۔ جو دراصل ''لاح یلوح'' کے مادہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ظاہر ہونے اور چمکنے کے ہیں۔ چونکہ صفحہ کے ایک طرف لکھنے سے حروف نمایاں ہو جاتے ہیں اور مطلب آشکار ہو جاتے ہیں، اس لئے صفحہ کو جس پر کچھ لکھا جائے ''لوح'' کہتے ہیں۔ لیکن روایات و اقوال مفسرین میں ان الواح کی کیفیت کے بارے میں اور ان کی جنس کے بارے میں گوناگوں احتمالات ذکر کئے گئے ہیں۔ چونکہ ان میں سے کوئی بھی یقینی نہیں ہے اس لئے ان کے ذکر سے ہم اعراض کرتے ہیں۔

2۔ کلام کیسے ہوا: قرآن کریم کی مختلف آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ خداوند متعال نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا، خدا کا موسیٰ علیہ السلام سے کلام کرنا اس طرح تھا کہ اس نے صوتی امواج کو فضا میں یا کسی جسم میں پیدا کر دیا تھا۔ کبھی یہ امواج صوتی ''شجرہ وادی ایمن'' سے ظاہر ہوتی تھیں اور کبھی ''کوہ طور'' سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کان میں پہنچتی تھیں۔ جن لوگوں نے صرف الفاظ پر نظر کی ہے اور اس پر غور نہیں کیا کہ یہ الفاظ کہاں سے نکل سکتے ہیں انہوں نے یہ خیال کیا کہ خدا کا کلام کرنا اس کے تجسم کی دلیل ہے۔ حالانکہ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے۔

مجسمہ سونے کا بنایا کہ اس طرح ان کی توجہ زیادہ سے زیادہ اس کی طرف مبذول کرا سکے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس محروم وفقیر ملت کے پاس اس روز اتنی مقدار میں زروز یور کہاں سے آ گیا کہ اس سے یہ مجسمہ تیار ہوگیا؟ اس کا جواب روایات میں اس طرح ملتا ہے کہ بنی اسرائیل کی عورتوں نے ایک تہوار کے موقع پر فرعونیوں سے زیورات مستعار لئے تھے یہ اسوقت کی بات ہے جس کے بعد ان کی غرقابی عمل میں آئی تھی۔ اس کے بعد وہ زیورات ان عورتوں کے پاس باقی رہ گئے تھے۔

اتنا ضرور ہے کہ یہ حادثہ مثل دیگر اجتماعی حوادث کے بغیر کسی آمادگی اور مقدمہ کے وقوع پذیر نہیں ہوا بلکہ اس میں متعدد اسباب کارفرما تھے، جن میں سے بعض یہ ہیں:

بنی اسرائیل عرصہ دراز سے اہل مصر کی بت پرستی دیکھتے آ رہے تھے۔

جب دریائے نیل کو عبور کیا تو انہوں نے ایک قوم کو دیکھا جو بت کی پرستش کرتی تھی۔ جیسا کہ قرآن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور گذشتہ میں بھی اس کا ذکر گزرا کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان کی طرح کا بت بنانے کی فرمائش کی جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں سخت سرزنش کی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے میقات کا پہلے تیس راتوں کا ہونا اس کے بعد چالیس راتوں کا ہوجانا اس سے بعض منافقوں کو یہ موقع ملا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کی افواہ پھیلا دیں۔

قوم موسیٰ علیہ السلام میں بہت سے افراد کا جہل و نادانی سے متصف ہونا اس کے مقابلے میں سامری کی مکاری ومہارت کیونکہ اس نے بڑی ہوشیاری سے بت پرستی کے پروگرام کو عملی جامہ پہنایا، بہرحال ان تمام باتوں نے اکٹھا ہوکر اس بات کے اسباب پیدا کئے کہ بنی اسرائیل کی اکثریت بت پرستی کو قبول کرے اور ''گوسالہ'' کے چاروں طرف اس کے ماننے والے ہنگامہ برپا کردیں۔

دو دن میں چھ لاکھ گوسالہ پرست بن گئے

سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ بنی اسرائیل میں یہ انحرافی تبدیلیاں صرف گنتی کے چند دنوں کے اندر واقع ہوگئیں جب موسیٰ علیہ السلام کو میعادگاہ کی طرف گئے ہوئے 35 دن گزر گئے تو سامری نے اپنا کام شروع کردیا اور بنی اسرائیل سے مطالبہ کیا کہ وہ تمام زیورات جو انہوں نے فرعونیوں سے عاریتاً لئے تھے اور ان کے غرق ہوجانے کے بعد وہ انہیں کے پاس رہ گئے تھے انہیں جمع کریں چھتیسویں، سنتیسویں اور اڑتیسویں دن انہیں ایک کٹھائی میں ڈالا اور پگھلا کر اس سے گوسالہ کا مجسمہ بنا دیا اور انتالیسویں دن انہیں اس کی پرستش کی دعوت دی اور ایک بہت بڑی تعداد (کچھ روایات کی بناء پر چھ لاکھ افراد) نے اسے قبول کرلیا اور ایک روز بعد یعنی چالیس روز گزرنے پر موسیٰ علیہ السلام واپس آ گئے۔

قرآن اس طرح فرماتا ہے: ''قوم موسیٰ نے موسیٰ کے میقات کی طرف جانے کے بعد اپنے زیورات وآلات سے ایک گوسالہ بنایا جو ایک بے جان جسد تھا جس میں سے گائے کی آواز آتی تھی''۔ [1]

''اسے انہوں نے اپنے واسطے انتخاب کیا''

---

[1] سورہ اعراف آیت 148

اگرچہ یہ عمل سامری سے سرزد ہوا تھا۔[1]

لیکن اس کی نسبت قوم موسیٰ کی طرف دی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے اس کام میں سامری کی مدد کی تھی اور وہ اس کے شریک جرم تھے اس کے علاوہ ان لوگوں کی بڑی تعداد اس کے فعل پر راضی تھی۔

قرآنی گفتگو کا ظاہر یہ ہے کہ تمام قوم موسیٰ اس گوسالہ پرستی میں شریک تھی لیکن اگر دوسری آیت پر نظر کی جائے جس میں آیا ہے کہ:

''قوم موسیٰ میں ایک امت تھی جو لوگوں کو حق کی ہدایت کرتی تھی اور اسی کی طرف متوجہ تھی''۔[2]

اس سے معلوم ہو گیا کہ اس سے مراد تمام امت موسیٰ نہیں ہے بلکہ اس کی اکثریت اس گوسالہ پرستی کی تابع ہو گئی تھی، جیسا کہ آئندہ آنے والا ہے کہ وہ اکثریت اتنی زیادہ تھی کہ حضرت ہارون علیہ السلام مع اپنے ساتھیوں کے ان کے مقالے میں ضعیف و ناتواں ہو گئے تھے

گوسالہ پرستوں کے خلاف شدید ردعمل

یہاں پر قرآن میں اس کشمکش اور نزاع کا ماجرا بیان کیا گیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور گوسالہ پرستوں کے درمیان واقع ہوئی جب وہ میعادگاہ سے واپس ہوئے جس کی طرف گذشتہ میں صرف اشارہ کیا گیا تھا یہاں پر تفصیل کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ردعمل کو بیان کیا گیا ہے جو اس گروہ کے بیدار کرنے کے لئے ان سے ظاہر ہوا۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ''جس وقت موسیٰ غضبناک و رنجیدہ اپنی قوم کی طرف پلٹے اور گوسالہ پرستی کا نفرت انگیز منظر دیکھا تو ان سے کہا کہ تم لوگ میرے بعد برے جانشین نکلے تم نے میرا آئین ضائع کر دیا''۔[3]

یہاں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام میعادگاہ پروردگار سے پلٹتے وقت قبل اس کے کہ بنی اسرائیل سے ملتے، غضبناک اور اندوہ گین تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ خدا نے میعادگاہ میں انہیں اس کی خبر دے دی تھی۔

جیسا کہ قرآن کہتا ہے: میں نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کی آزمائش کی لیکن وہ اس آزمائش میں پوری نہ اتری اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا۔

اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: ''آیا تم نے اپنے پروردگار کے فرمان کے بارے میں جلدی کی''۔[4]

تم نے خدا کے اس فرمان، کہ اس نے میعاد کا وقت تیس شب سے چالیس شب کر دیا، جلدی کی اور جلد فیصلہ کر دیا، میرے نہ آنے کو میرے مرنے یا وعدہ خلافی کی دلیل سمجھ لیا، حالانکہ لازم تھا کہ تھوڑا صبر سے کام لیتے، چند روز اور انتظار کر لیتے تا کہ حقیقت واضح ہو جاتی۔

اس وقت جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی زندگی کے ان طوفانی و بحرانی لمحات سے گزر رہے تھے، سر سے پیر تک غصہ اور افسوس کی شدت سے بھڑک رہے تھے، ایک عظیم اندوہ نے ان کے وجود پر سایہ ڈال دیا تھا اور انہیں بنی اسرائیل کے مستقبل کے

---

[1] جیسا کہ سورہ طٰہٰ کی آیات میں آیا ہے

[2] سورہ اعراف آیت 159

[3] سورہ اعراف آیت 150

[4] سورہ اعراف آیت 150

بارے میں بڑی تشویش لاحق تھی، کیونکہ تخریب اور تباہ کاری آسانی سے ہوجاتی ہے کبھی صرف ایک انسان کے ذریعے بہت بڑی خرابی اور تباہی واقع ہوجاتی ہے لیکن اصلاح اور تعمیر میں دیر لگتی ہے۔

خاص طور پر جب کسی نادان متعصب اور ہٹ دھرم قوم کے درمیان کوئی غلط ساز بجاد یا جائے تو اس کے بعد اس کے برے اثرات کا زائل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

بے نظیر غصہ

اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غصہ کرنا چاہئے تھا اور ایک شدید ردّعمل ظاہر کرنا چاہئے تھا تاکہ بنی اسرائیل کے فاسد افکار کی بنیاد گرا کر اس منحرف قوم میں انقلاب برپا کردیں، ورنہ تو اس قوم کو پلٹانا مشکل تھا۔

قرآن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ شدید ردّعمل بیان کیا ہے جو اس طوفانی و بحرانی منظر کو دیکھنے کے بعد ان سے ظاہر ہوا، موسیٰ علیہ السلام نے بے اختیار نہ طور پر اپنے ہاتھ سے توریت کی الواح کو زمین پر ڈال دیا اور اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کے پاس گئے اور ان کے سر اور داڑھی کے بالوں کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ [1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے علاوہ ہارون علیہ السلام کو بڑی شدت سے سرزنش کی اور بآواز بلند چیخ کر پکارے:

''کیا تم نے بنی اسرائیل کے عقائد کی حفاظت میں کوتاہی کی اور میرے فرمان کی مخالفت کی؟'' [2]

درحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ ردّعمل ایک طرف تو ان کی اس واردات قلبی، بے قراری اور شدید ناراضی کی حکایت کرتا ہے تاکہ بنی اسرائیل کی عقل میں ایک حرکت پیدا ہو اور وہ اپنے اس عمل کی قباحت کی طرف متوجہ ہوجائیں۔

بنابرایں اگرچہ بالفرض الواح توریت کا پھینک دینا قابل اعتراض معلوم ہوتا ہو، اور بھائی کی شدید سرزنش نادرست ہو لیکن اگر حقیقت کی طرف توجہ کی جائے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس شدید اور پر ہیجانی ردّعمل کا اظہار نہ کرتے تو ہرگز بنی اسرائیل اپنی غلطی کی سنگینی اور اہمیت کا اندازہ نہیں کرسکتے تھے، ممکن تھا کہ اس بت پرستی کے آثار بدان کے ذہنوں میں باقی رہ جاتے لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ کیا وہ نہ صرف غلط نہ تھا بلکہ امر لازم تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس واقعہ سے اس قدر ناراض ہوئے کہ تاریخ بنی اسرائیل میں کبھی اس قدر ناراض نہ ہوئے تھے کیونکہ ان کے سامنے بدترین منظر تھا یعنی بنی اسرائیل خدا پرستی کو چھوڑ کر گوسالہ پرستی اختیار کرچکے تھے جس کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وہ تمام زحمتیں جو انہوں نے بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے کی تھیں سب برباد ہورہی تھیں۔

لہٰذا ایسے موقع پر الواح کا ہاتھوں سے گرجانا اور بھائی سے سخت مواخذہ کرنا ایک طبعی امر تھا۔

اے میری ماں کے بیٹے میں بے گناہ ہوں

اس شدید ردّعمل اور غیظ وغضب کے اظہار نے بنی اسرائیل پر بہت زیادہ تربیتی اثر مرتب کیا اور منظر کو بالکل پلٹ دیا جبکہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نرم زبان استعمال کرتے تو شاید اس کا تھوڑا سا اثر بھی مرتب نہ ہوتا۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کی محبت کو برانگیختہ کرنے کے لئے اور اپنی بے گناہی بیان کرنے کے

---

[1] سورہ اعراف آیت 150

[2] سورہ اعراف آیت 150

لئے کہا:

''اے میرے ماں جائے: اس نادان امت کے باعث ہم اس قدر قلیل ہو گئے کہ نزدیک تھا کہ مجھے قتل کر دیں لہٰذا میں بالکل بے گناہ ہوں لہٰذا آپ کوئی ایسا کام نہ کریں کہ دشمن ہنسی اڑائیں اور مجھے اس ستم گر امت کی صف میں قرار نہ دیں''۔ [1]

قرآن میں جو ''ابن ام'' کی تعبیر آئی ہے جس کے معنی (اے میری ماں کے بیٹے، کے ہیں) حالانکہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام دونوں ایک والدین کی اولاد تھے یہ اس لئے تھا کہ حضرت ہارون چاہتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جذبہ محبت بیدار کریں بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ تدبیر کارآمد ہوئی اور بنی اسرائیل کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے توبہ کی خواہش کا اظہار کیا۔

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آتش غضب کم ہوئی اور وہ درگاہ خداوندی کی طرف متوجہ ہوئے اور عرض کی:

''پروردگارا مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت بے پایاں میں داخل کر دے، تو تمام مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے''۔ [2]

اپنے لئے اور اپنے بھائی کے لئے بخشش طلب کرنا اس بنا پر نہیں تھا کہ ان سے کوئی گناہ سرزد ہوا تھا بلکہ یہ پروردگار کی بارگاہ میں ایک طرح کا خضوع و خشوع تھا اور اس کی طرف بازگشت تھی اور بت پرستوں کے اعمال زشت سے اظہار تنفر تھا۔ [3]

جیسا کہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ''گوسالہ'' کو نہ تو بنی اسرائیل نے بنایا تھا نہ حضرت ہارون علیہ السلام نے، بلکہ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص سامری نے یہ حرکت کی تھی، جس پر حضرت ہارون علیہ السلام جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی اور ان کے معاون تھے خاموش نہ بیٹھے بلکہ انہوں نے اپنی پوری کوشش صرف کی، انہوں نے اتنی کوشش کی کہ نزدیک تھا کہ لوگ انہیں قتل کر دیتے۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ موجودہ توریت میں گوسالہ سازی اور بت پرستی کی طرف دعوت کو حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف نسبت دی گئی ہے، چنانچہ توریت کے سفر خروج کی فصل 32 میں یہ عبارت ملتی ہے:

''جس وقت قوم موسیٰ نے دیکھا کہ موسیٰ کے پہاڑ سے نیچے اترنے میں دیر ہوئی تو وہ ہارون کے پاس اکٹھا ہوئے اور ان سے کہا اٹھو اور ہمارے لئے ایسا خدا بناؤ جو ہمارے آگے آگے چلے کیونکہ یہ شخص موسیٰ جو ہم کو مصر سے نکال کر یہاں لایا ہے نہیں معلوم اس پر کیا گذری، ہارون نے ان سے کہا: طلائی بندے (گوشوارے) جو تمہاری عورتوں اور بچوں کے کانوں میں ہیں انہیں ان کے کانوں سے اتار کر میرے پاس لاؤ، پس پوری قوم ان گوشواروں کو کانوں سے جدا کر کے ہارون کے پاس لائی، ہارون نے ان گوشواروں کو ان لوگوں کے ہاتھوں سے لیا اور کندہ کرنے کے ایک آلہ کے ذریعے تصویر بنائی اور اس سے ایک گوسالہ کا مجسمہ ڈھالا اور کہا کہ اے بنی اسرائیل یہ تمہارا خدا ہے جو تمہیں سرزمین مصر سے باہر لایا ہے''۔

اسی کے ذیل میں ان مراسم کو بیان کیا گیا ہے جو حضرت ہارون نے اس بت کے سامنے قربانی کرنے کے بارے میں بیان کئے تھے۔

جو کچھ سطور بالا میں بیان ہوا یہ بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کی داستان کا ایک حصہ ہے جو توریت میں مذکور ہے اس کی عبارت بعینہٖ نقل کی گئی ہے حالانکہ خود توریت نے حضرت ہارون کے مقام بلند کو متعدد فصول میں بیان کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے

---

[1] سورہ اعراف آیت 151

[2] سورہ اعراف آیت 150

[3] قرآن اور موجودہ توریت کا ایک موازنہ

کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات حضرت ہارون علیہ السلام کے ذریعے ظاہر ہوئے تھے (فصل 8 از سفر خروج توریت) اور ہارون علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک رسول کی حیثیت سے تعارف کروایا گیا ہے۔

طلائی گوسالہ سے کس طرح آواز پیدا ہوئی؟

سامری جو کہ ایک صاحب فن انسان تھا اس نے اپنی معلومات سے کام لے کر طلائی گوسالہ کے سینے میں کچھ مخصوص نل (PIPE) اس طرح مخفی کر دیئے جن کے اندر سے دباؤ کی وجہ سے جب ہوا نکلتی تھی تو گائے کی آواز آتی تھی۔

کچھ کا خیال ہے کہ گوسالہ کا منہ اس طرح کا پیچیدہ بنایا گیا تھا کہ جب اسے ہوا کے رخ پر رکھا جاتا تھا تو اس کے منہ سے یہ آواز نکلتی تھی۔

قرآن میں پڑھتے ہیں کہ جناب موسیٰ نے سامری سے باز پرس شروع کی اور کہا: ''یہ کیا کام تھا کہ جو تو نے انجام دیا ہے اور اے سامری: تجھے کس چیز نے اس بات پر آمادہ کیا۔

اس نے جواب میں کہا: ''میں کچھ ایسے مطالب سے آگاہ ہوا کہ جو انہوں نے نہیں دیکھے اور وہ اس سے آگاہ نہیں ہوئے''۔

بہرکیف حضرت ہارون علیہ السلام جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانشین برحق تھے اور ان کی شریعت کے سب سے بڑے عالم وعارف تھے توریت ان کے لئے مقام بلند کی قائل ہے اب ذرا ان خرافات کو بھی دیکھ لیجئے کہ انہیں ایک بت ساز ہی نہیں بلکہ ایک مؤسس بت پرستی کی حیثیت سے روشناس کرایا ہے بلکہ ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' کے مقولہ کے مطابق ان کی جانب سے ایک غلط عذر پیش کیا کیونکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر اعتراض کیا تو انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ چونکہ یہ قوم بدی کی طرف مائل تھی اس لئے میں نے بھی اسے اس راہ پر لگا دیا جبکہ قرآن ان دونوں بلند پایہ پیغمبروں کو ہر قسم کے شرک اور بت پرستی سے پاک وصاف سمجھتا ہے۔ صرف یہی ایک مقام نہیں جہاں قرآن تاریخ انبیاء ومرسلین کی پاکی وتقدس کا مظہر ہے جبکہ موجودہ توریت کی تاریخ انبیاء ومرسلین کی ساحت قدس کے متعلق انواع واقسام کی خرافات سے بھری ہوئی ہے ہمارے عقیدہ کے مطابق حقانیت واصالت قرآن اور موجودہ توریت وانجیل کی تحریف کو پہچاننے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان دونوں میں انبیاء کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے اس کا موازنہ کر لیا جائے اس سے اپنے آپ پتہ چل جائیگا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟

''میں نے ایک چیز خدا کے بھیجے ہوئے رسول کے آثار میں سے لی اور پھر میں نے اسے دور پھینک دیا اور میرے نفس نے اس بات کو اسی طرح مجھے خوش نما کر کے دکھایا''[1]

اس بارے میں کہ اس گفتگو سے سامری کی کیا مراد تھی، مفسرین کے درمیان دو تفسیریں مشہور ہیں: پہلی یہ کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ فرعون کے لشکر کے دریائے نیل کے پاس آنے کے موقع پر میں نے جبرائیل کو ایک سواری پر سوار دیکھا کہ وہ لشکر کو دریا کے خشک شدہ راستوں پر ورود کے لئے تشویق دینے کی خاطر ان کے آگے آگے چل رہا تھا میں نے کچھ مٹی ان کے پاؤں کے نیچے سے یا ان کی سواری کے پاؤں کے نیچے سے اٹھالی اور اسے سنبھال کر رکھا اور اسے سونے کے بچھڑے کے اندر ڈالا اور یہ صدا اسی کی برکت سے پیدا ہوئی ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ میں ابتدا میں خدا کے اس رسول (موسیٰ) کے کچھ آثار پر ایمان لے آیا اس کے بعد مجھے اس میں کچھ

---

[1] سورہ طٰہٰ آیت 96

شک اور تردد ہوا لہٰذا میں نے اسے دور پھینک دیا اور بت پرستی کے دین کی طرف مائل ہو گیا اور یہ میری نظر میں زیادہ پسندیدہ اور زیبا ہے۔

سامری کی سزا

یہ بات صاف طور پر واضح اور روشن ہے کہ موسیٰ کے سوال کے جواب میں سامری کی بات کسی طرح بھی قابل قبول نہیں تھی، لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے مجرم ہونے کا فرمان اسی عدالت میں صادر کر دیا اور اسے اس گوسالہ پرستی کے بارے میں تین حکم دیئے۔

پہلا حکم یہ کہ اس سے کہا ''تو لوگوں کے درمیان سے نکل جا اور کسی کے ساتھ میل ملاپ نہ کر اور تیری باقی زندگی میں تیرا حصہ صرف اتنا ہے کہ جو شخص بھی تیرے قریب آئے گا تو اس سے کہے گا: مجھ سے مس نہ ہو''۔[1]

اس طرح ایک قاطع اور دوٹوک فرمان کے ذریعے سامری کو معاشرے سے باہر نکال پھینکا اور اسے مطلق گوشہ نشینی میں ڈال دیا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''مجھ سے مس نہ ہو'' کا جملہ شریعت موسیٰ علیہ السلام کے ایک فوجداری قانون کی طرف اشارہ ہے کہ جو بعض ایسے افراد کے بارے میں کہ جو سنگین جرم کے مرتکب ہوتے تھے صادر ہوتا تھا وہ شخص ایک ایسے موجود کی حیثیت سے کہ جو پلید ونجس وناپاک ہو، قرار پاجاتا تھا کوئی اس سے میل ملاپ نہ کرے اور نہ اسے یہ حق ہوتا تھا وہ کسی سے میل ملاپ رکھے۔

سامری اس واقعے کے بعد مجبور ہو گیا کہ وہ بنی اسرائیل اور ان کے شہر ودیار سے باہر نکل جائے اور بیابانوں میں جا رہے اور یہ اس جاہ طلب انسان کی سزا ہے کہ جو اپنی بدعتوں کے ذریعے چاہتا تھا کہ بڑے بڑے گروہوں کو منحرف کر کے اپنے گرد جمع کرے، اسے ناکام ہی ہونا چاہئے یہاں تک کہ ایک بھی شخص اس سے میل ملاپ نہ رکھے اور اس قسم کے انسان کے لئے یہ مکمل بائیکاٹ موت اور قتل ہونے سے بھی زیادہ سخت ہے کیونکہ وہ ایک پلید اور آلودہ وجود کی صورت میں ہر جگہ سے راندہ اور دھتکارا ہوا ہوتا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ سامری کا بڑا جرم ثابت ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے بارے میں نفرین کی اور خدا نے اسے ایک پراسرار بیماری میں مبتلا کر دیا کہ جب تک وہ زندہ رہا کوئی شخص اسے چھو نہیں سکتا تھا اور اگر کوئی اسے چھو لیتا تو وہ بھی بیماری میں گرفتار ہو جاتا۔ یا یہ کہ سامری ایک قسم کی نفسیاتی بیماری میں جو ہر شخص سے وسواس شدید اور وحشت کی صورت میں تھی؛ گرفتار ہو گیا، اس طرح سے کہ جو شخص بھی اس کے نزدیک ہوتا وہ چلاتا کہ ''مجھے مت چھونا''۔ سامری کے لئے دوسری سزا یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے قیامت میں ہونے والے عذاب کی بھی خبر دی اور کہا: ''تیرے آگے ایک وعدہ گاہ ہے، خدائی دردناک عذاب کا وعدہ کہ جس سے ہرگز نہیں بچ سکے گا''۔[2]

تیسرا کام یہ تھا کہ جو موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے کہا: ''اپنے اس معبود کو کہ جس کی تو ہمیشہ عبادت کرتا تھا ذرا دیکھ اور نگاہ کر ہم

---

[1] سورہ طٰہٰ آیت 97

[2] سورہ طٰہٰ آیت 97

اس کو جلا رہے ہیں اور پھر اس کے ذرات کو دریا میں بکھیر دیں گے'' (تاکہ ہمیشہ کے لئے نابود ہو جائے)۔[1]

گناہ عظیم اور کم نظیر توبہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس شدید ردعمل نے اپنا اثر دکھایا اور جن لوگوں نے گوسالہ پرستی اختیار کی تھی اور ان کی تعداد اکثریت میں تھی وہ اپنے کام سے پشیمان ہوئے ان کی شاید مذکورہ پشیمانی کافی تھی، قرآن نے یہ اضافہ کیا ہے: باقی رہتا ہے یہ سوال کہ اس ''غضب اور ذلت'' سے کیا مراد ہے؟ قرآن نے اس امر کی کوئی توضیح نہیں کی ہے صرف سربستہ کہہ کر بات آگے بڑھا دی ہے۔

لیکن ممکن ہے اس سے ان بدبختیوں اور پریشانیوں کی جانب اشارہ مقصود ہو جو اس ماجرے کے بعد اور بیت المقدس میں ان کی حکومت سے پہلے انہیں پیش آئیں۔

یا اس سے مراد اللہ کا وہ حکم ہو جو اس گناہ کے بعد انہیں دیا گیا کہ وہ بطور پاداش ایک دوسرے کو قتل کریں۔

قرآن اس کے بعد اس گناہ سے توبہ کے سلسلے میں کہتا ہے: ''اور یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے قوم تم نے بچھڑے کو منتخب کر کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اب جو ایسا ہو گیا ہے تو توبہ کرو اور اپنے پیدا کرنے والے کی طرف پلٹ آؤ''۔

''تمہاری توبہ اس طرح ہونی چاہئے کہ تم ایک دوسرے کو قتل کرو۔ یہ کام تمہارے لئے تمہارے خالق کی بارگاہ میں بہتر ہے۔ اس ماجرے کے بعد خدا نے تمہاری توبہ قبول کر لی جو توّاب و رحیم ہے''۔[2]

اس میں شک نہیں کہ سامری کے بچھڑے کی پرستش و عبادت کوئی معمولی بات نہ تھی وہ قوم جو خدا کی یہ تمام آیات دیکھ چکی تھی اور اپنے عظیم پیغمبر کے معجزات کا مشاہدہ کر چکی تھی ان سب کو بھول کر پیغمبر کی ایک مختصر سی غیبت میں اصل توحید اور آئین خداوندی کو پورے طور پر پاؤں تلے روندے اور بت پرست ہو جائے۔

اب اگر یہ بات ان کے دماغ سے ہمیشہ کے لئے جڑ سے نہ نکالی جاتی تو خطرناک حالت پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اور ہر موقعے کے بعد اور خصوصاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے بعد ممکن تھا ان کی دعوت کی تمام آیات ختم کر دی جاتیں اور اس عظیم قوم کی تقدیر مکمل طور پر خطرے سے دوچار ہو جاتی۔

اکٹھا قتل

یہاں شدت عمل سے کام لیا گیا اور صرف پشیمانی اور زبان سے اظہار توبہ پر ہرگز قناعت نہ کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کی

---

[1] سورہ طٰہٰ آیت 97

سامری کون ہے؟ اصل لفظ ''سامری'' عبرانی زبان میں ''شمری'' ہے اور چونکہ یہ معمول ہے کہ جب عبرانی زبان کے الفاظ عربی زبان میں آتے ہیں تو ''شین'' کا لفظ ''سین'' سے بدل جاتا ہے، جیسا کہ ''موشی'' ''موسیٰ'' سے اور ''یشوع'' ''یسوع'' سے تبدیل ہو جاتا ہے اس بناء پر سامری بھی ''شمرون'' کی طرف منسوب تھا اور ''شمرون'' ''یشاکر'' کا بیٹا تھا، جو یعقوب کی چوتھی نسل ہے۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ بعض عیسائیوں کا قرآن پر یہ اعتراض بالکل بے بنیاد ہے کہ قرآن نے ایک ایسے شخص کو کہ جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں رہتا تھا اور وہ گوسالہ پرستی کا سرپرست بنا تھا، شہر سامرہ سے منسوب ''سامری'' کے طور پر متعارف کرایا ہے، جب کہ شہر سامرہ اس زمانے میں بالکل موجود ہی نہیں تھا، کیونکہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ''سامری'' شمرون کی طرف منسوب ہے نہ کہ سامرہ شہر کی طرف۔

بہرحال سامری ایک خودخواہ اور منحرف شخص ہونے کے باوجود بڑا ہوشیار تھا وہ بڑی جرأت اور مہارت کے ساتھ بنی اسرائیل کے ضعف کے نکات اور کمزوری کے پہلوؤں سے استفادہ کرتے ہوئے اس قسم کا عظیم فتنہ کھڑا کرنے پر قادر ہو گیا کہ جو ایک قطعی اکثریت کے بت پرستی کی طرف مائل ہونے کا سبب بنے اور جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ اس نے اپنی اس خودخواہی اور فتنہ انگیزی کی سزا بھی اسی دنیا میں دیکھ لی۔

[2] سورہ بقرہ آیت 54

طرف سے ایسا سخت حکم صادر ہوا جس کی مثال تمام انبیاء کی طویل تاریخ میں کہیں نہیں ملتی اور وہ یہ کہ توبہ اور توحید کی طرف بازگشت کے سلسلے میں گناہگاروں کے کثیر گروہ کے لئے اکٹھا قتل کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہ فرمان بھی ایک خاص طریقے سے جاری ہونا چاہئے تھا اور وہ یہ ہوا کہ وہ لوگ خود تلواریں ہاتھ میں لے کر ایک دوسرے کو قتل کریں کہ ایک اس کا اپنا مارا جانا عذاب ہے اور دوسرا دوستوں اور شناساؤں کا قتل کرنا۔

بعض روایات کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا کہ ایک تاریک رات میں وہ تمام لوگ جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی غسل کریں کفن پہن لیں اور صفیں باندھ کر ایک دوسرے پر تلوار چلائیں۔

ممکن ہے یہ تصور کیا جائے کہ یہ توبہ کیوں اتنی سختی سے انجام پذیر ہوئی کیا یہ ممکن نہ تھا کہ خدا ان کی توبہ کو بغیر اس خونریزی کے قبول کر لیتا۔

اس سوال کا جواب گذشتہ گفتگو سے واضح ہوجاتا ہے کیونکہ اصل توحید سے انحراف اور بت پرستی کی طرف جھکاؤ کا مسئلہ اتنا سادہ اور آسان نہ تھا کہ اتنی آسانی سے درگذر کر دیا جاتا اور وہ بھی ان واضح معجزات اور خدا کی بڑی بڑی نعمتوں کے مشاہدے کے بعد۔ درحقیقت ادیان آسمانی کے تمام اصولوں کو توحید اور یگانہ پرستی میں جمع کیا جاسکتا ہے۔ اس اصل کا متزلزل ہونا دین کی تمام بنیادوں کے خاتمے کے برابر ہے اگر گاؤ پرستی کے مسئلے کو آسان سمجھ لیا جاتا تو شاید آنے والے لوگوں کے لئے سنت بن جاتا۔

خصوصاً بنی اسرائیل کے لئے جن کے بارے میں تاریخ شاہد ہے کہ ضدی اور بہانہ باز لوگ تھے۔ لہٰذا چاہئے تھا کہ ان کی ایسی گوشمالی کی جائے کہ اس کی چبھن تمام صدیوں اور زمانوں تک باقی رہ جائے اور اس کے بعد کوئی شخص بت پرستی کی فکر میں نہ پڑے۔

خدا کی آیات کو مضبوطی سے پکڑ لو

عظیم اسلامی مفسر مرحوم طبرسی، ابن زید کا قول اس طرح نقل کرتے ہیں: جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے واپس آئے اور اپنے ساتھ توریت لائے تو اپنی قوم کو بتایا کہ میں آسمانی کتاب لے کر آیا ہوں جو دینی احکام اور حلال وحرام پر مشتمل ہے۔ یہ وہ احکام ہیں جنہیں خدا نے تمہارے لئے عملی پروگرام قرار دیا ہے۔ اسے لے کر اس کے احکام پر عمل کرو۔ اس بہانے سے کہ یہ ان کے لئے مشکل احکام ہیں، یہودی نافرمانی اور سرکشی پر تل گئے۔ خدا نے بھی فرشتوں کو مامور کیا کہ وہ کوہ طور کا ایک بہت بڑا ٹکڑا ان کے سروں پر لا کر کھڑا کر دیں، اسی اثناء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں خبر دی کہ عہد و پیمان باندھ لو، احکام خدا پر عمل کرو، سرکشی و بغاوت سے توبہ کرو تو تم سے یہ عذاب ٹل جائے گا ورنہ سب ہلاک ہوجاؤ گے۔

اس پر انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ توریت کو قبول کیا اور خدا کے حضور میں سجدہ کیا۔ جب کہ ہر لحظہ وہ کوہ طور کے اپنے سروں پر گرنے کے منتظر تھے لیکن بالآخر ان کی توبہ کی وجہ سے عذاب الٰہی ٹل گیا۔

یہ نکتہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ کوہ طور کے بنی اسرائیل کے سروں پر مسلط ہونے کی کیفیت کے سلسلے میں مفسرین کی ایک جماعت کا اعتقاد ہے کہ حکم خدا سے کوہ طور اپنی جگہ سے اکھڑ گیا اور سائبان کی طرح ان کے سروں پر مسلط ہوگیا۔

جبکہ بعض دوسرے مفسرین یہ کہتے ہیں کہ پہاڑ میں سخت قسم کا زلزلہ آیا، پہاڑ اس طرح لرزنے اور حرکت کرنے لگا کہ کسی بھی وقت وہ ان کے سروں پر آگرے گا لیکن خدا کے لطف و کرم سے زلزلہ رک گیا اور پہاڑ اپنی جگہ پر قائم ہوگیا۔

یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ پہاڑ کا ایک بہت بڑا ٹکڑا زلزلے اور شدید بجلی کے زیر اثر اپنی جگہ سے اکھڑ کر ان کے سروں کے اوپر سے بحکم خدا اس طرح گزرا ہو کہ چند لحظے انہوں نے اسے اپنے سروں پر دیکھا ہو اور یہ خیال کیا ہو کہ وہ ان پر گرنا چاہتا ہے لیکن یہ عذاب ان سے ٹل گیا اور وہ ٹکڑا کہیں دور جا گرا۔ [1]

آیئے واقعہ کی تفصیل قرآن میں پڑھتے ہیں کہ: ''اور (وہ وقت کہ) جب ہم نے تم سے عہد لیا اور کوہ طور کو تمہارے سروں کے اوپر مسلط کر دیا اور تمہیں کہا کہ، جو کچھ (آیات واحکام میں) ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے تھامو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو (اور اس پر عمل کرو) شاید اس طرح تم پرہیز گار ہو جاؤ''۔ [2]

''اس کے بعد پھر تم نے روگردانی کی اور اگر تم پر خدا کا فضل ورحمت نہ ہوتا تو تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوتے''۔ [3]

اس عہد و پیمان میں یہ چیزیں شامل تھیں: پروردگار کی توحید پر ایمان رکھنا، ماں باپ، عزیز و اقارب، یتیم اور حاجت مندو ں سے نیکی کرنا اور خونریزی سے پرہیز کرنا۔ یہ کلی طور پر ان صحیح عقائد اور خدائی پروگراموں کے بارے میں عہد و پیمان تھا جن کا توریت میں ذکر کیا گیا تھا۔

کوہ طور

کوہ طور سے مراد یہاں اسم جنس ہے یا یہ مخصوص پہاڑ ہے۔ اس سلسلے میں دو تفسیریں موجود ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ طور اسی مشہور پہاڑ کی طرف اشارہ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی۔

لیکن بعض کے نزدیک یہ احتمال بھی ہے کہ طور لغوی معنی کے لحاظ سے مطلق پہاڑ ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے سورہ اعراف کی آیہ 171 میں ''جبل'' سے تعبیر کیا گیا ہے:

توریت کیا ہے

توریت عبرانی زبان کا لفظ ہے، اس کا معنی ہے ''شریعت'' اور ''قانون''۔ یہ لفظ خدا کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام بن عمران پر نازل ہونے والی کتاب کے لئے بولا جاتا ہے۔ نیز بعض اوقات عہد عتیق کی کتب کے مجموعے کے لئے اور کبھی کبھی توریت کے پانچوں اسفار کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہودیوں کی کتب کے مجموعے کو عہد عتیق کہتے ہیں۔ اس میں توریت اور چند دیگر کتب شامل ہیں۔

توریت کے پانچ حصے ہیں: جنہیں سفر پیدائش، سفر خروج، سفر لاویان، سفر اعداد اور سفر تثنیہ کہتے ہیں۔ اس کے موضوعات یہ ہیں:

---

[1] کیا اس عہد و پیمان میں جبر کا پہلو ہے: اس سوال کے جواب میں بعض کہتے ہیں کہ ان کے سروں پر پہاڑ کا مسلط ہونا ڈرانے دھمکانے کے طور پر تھا نہ کہ جبر واضطرار کے طور پر ورنہ جبری عہد و پیمان کی تو کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ لیکن زیادہ صحیح یہی ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ سرکش اور باغی افراد کو تہدید و سزا کے ذریعے حق کے سامنے جھکا دیا جائے۔ یہ تہدید اور سختی جو وقتی طور پر ہے ان کے غرور کو توڑ دے گی۔ انہیں صحیح غور وفکر پر ابھارے گی اور اس راستے پر چلتے چلتے وہ اپنے ارادہ واختیار سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے لگیں گے۔ بہرحال یہ پیمان زیادہ تر عملی پہلوؤں سے مربوط تھا ورنہ عقائد کو تو جبر واکراہ سے نہیں بدلا جاسکتا۔

[2] سورہ بقرہ آیت 63

[3] سورہ بقرہ آیت 63

(1) کائنات، انسان اور دیگر مخلوقات کی خلقت۔

(2) حضرت موسیٰ علیہ السلام بن عمران، گذشتہ انبیاء اور بنی اسرائیل کے حالات وغیرہ۔

(3) اس دین کے احکام کی تشریح۔

عہد عتیق کی دیگر کتابیں دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کے مؤرخین کی تحریر کردہ ہیں۔ ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام بن عمران کے بعد کے نبیوں، حکمرانوں اور قوموں کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔

یہ بات بغیر کہے واضح ہے کہ توریت کے پانچوں اسفار سے اگر صرف نظر کرلیا جائے تو دیگر کتب میں سے کوئی کتاب بھی آسمانی کتاب نہیں ہے۔ خود یہودی بھی اس کا دعویٰ نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ حضرت داؤد علیہ السلام سے منسوب زبور جسے وہ ''مزامیر'' کہتے ہیں، حضرت داود علیہ السلام کے مناجات اور پند ونصائح کی تشریح ہے۔

رہی بات توریت کے پانچوں سفروں کی تو ان میں ایسے واضح قرائن موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ بھی آسمانی کتابیں نہیں ہیں بلکہ وہ تاریخی کتاب ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد لکھی گئی ہیں کیونکہ ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات، ان کے دفن کی کیفیت اور ان کی وفات کے بعد کے کچھ حالات مذکور ہیں۔

خصوصاً سفر تثنیہ کے آخری حصے میں یہ بات وضاحت سے ثابت ہوتی ہے کہ یہ کتاب حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کی وفات سے کافی مدت بعد لکھی گئی ہے۔

علاوہ ازیں ان کتب میں بہت سی خرافات اور ناروا باتیں انبیاء ومرسلین سے منسوب کردی گئی ہیں۔ بعض بچگانہ باتیں بھی ہیں جو ان کے خود ساختہ اور جعلی ہونے پر گواہ ہیں نیز بعض تاریخی شواہد بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ اصلی توریت غائب ہوگئی اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام بن عمران علیہ السلام کے پیروکاروں نے یہ کتابیں تحریر کیں۔

حضرت خضر علیہ السلام

ابی بن کعب نے ابن عباس کی وساطت سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث اس طرح نقل کی ہے: ''ایک دن موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے خطاب کررہے تھے۔ کسی نے آپؑ سے پوچھا روئے زمین پر سب سے زیادہ علم کون رکھتا ہے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا مجھے اپنے آپ سے بڑھ کر کسی کے عالم ہونے کا علم نہیں۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام کو وحی ہوئی کہ ہمارا ایک بندہ مجمع البحرین میں ہے کہ جو تجھ سے زیادہ عالم ہے۔ اس قت موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی کہ میں اس عالم کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر اللہ نے انہیں ان سے ملاقات کی راہ بتائی''۔

یہ درحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تنبیہ تھی کہ اپنے تمام تر علم وفضل کے باوجود اپنے آپ کو افضل ترین نہ سمجھیں۔ [1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کہ جو اس زمانے کے بڑے عالم تھے ان کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ یہ واقعہ نشاندہی کرتا ہے کہ

---

[1] لیکن یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا ایک اولوالعزم صاحب رسالت وشریعت شخص کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم نہیں ہونا چاہئے؟ اس سوال کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اپنی ماموریت کی قلمرو میں نظام تشریع میں اسے سب سے بڑا عالم ہونا چاہئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی طرح تھے لیکن ان کی ماموریت کی قلمرو ان کے عالم دوست کی قلمرو سے الگ تھی۔ ان کے عالم دوست کی ماموریت کا تعلق عالم بشریت سے نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ عالم ایسے اسرار سے آگاہ تھے کہ جو دعوت نبوت کی بنیاد نہ تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر کہ جو اپنے ماحول کے آگاہ ترین اور عالم ترین فرد تھے، بعض پہلوؤں سے ان کا علم بھی محدود تھا لہٰذا وہ استاد کی تلاش میں نکلے تا کہ اس سے درس لیں، استاد نے بھی ایسے درس دیئے کہ جن میں سے ہر ایک دوسرے سے عجیب تر ہے۔ اس داستان میں بہت سے اہم نکات پوشیدہ ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام، جناب خضر علیہ السلام کی تلاش میں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کسی نہایت اہم چیز کی تلاش تھی۔ وہ اس کی جستجو میں در بدر پھر رہے تھے۔ وہ عزم بالجزم اور پختہ ارادے سے اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ ارادہ کئے ہوئے تھے کہ جب تک اپنا مقصود نہ پالیں چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جس کی تلاش پر مامور تھے اس کا آپؑ کی زندگی پر بہت گہرا اثر ہوا اور اس نے آپؑ کی زندگی کا نیا باب کھول دیا۔ جی ہاں وہ ایک مرد عالم و دانشمند کی جستجو میں تھے۔ ایسا عالم کہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے سے بھی حجاب ہٹا سکتا تھا اور انہیں نئے حقائق سے روشناس کروا سکتا تھا اور ان کے لئے علوم و دانش کے تازہ باب کھول سکتا تھا۔

ایک حدیث کہ جو امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے اس میں صراحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ، حضرت خضر علیہما السلام سے زیادہ عالم تھے یعنی علم شریعت میں۔

شاید اس سوال کا جواب نہ پانے کی وجہ سے اور نسیان سے مربوط سوال کا جواب نہ پانے کے سبب بعض نے ان آیات میں جن موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے اسے موسیٰ بن عمران تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

ایک حدیث کہ جو حضرت علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے اس سے بھی یہ نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کا دائرہ کار اور قلمرو ایک دوسرے سے مختلف تھی اور ہر ایک دوسرے سے اپنے کام میں زیادہ عالم تھا۔

ہم اس سلسلے میں جلد پڑھیں گے کہ اس عالم بزرگ کی جگہ معلوم کرنے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک نشانی تھی اور وہ اس نشانی کے مطابق ہی چل رہے تھے۔

قرآن کہتا ہے: ''وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ نے اپنے دوست اور ساتھی جوان سے کہا کہ میں تو کوشش جاری رکھوں گا جب تک ''مجمع البحرین'' تک نہ پہنچ جاؤں، اگرچہ مجھے یہ سفر لمبی مدت تک جاری رکھنا پڑے''۔[1]

مجمع البحرین کا مطلب ہے دو دریاؤں کا سنگم۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ ''بحرین'' سے یہاں کون سے دو دریا ہیں۔ اس سلسلے میں تین مشہور نظریئے یں:

1۔ خلیج عقبہ اور خلیج سویز کے ملنے کی جگہ۔ ہم جانتے ہیں کہ بحیرہ احمر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ شمال مشرق کی طرف بڑھتا رہتا ہے اور دوسرا شمال مغرب کی طرف پہلے حصے کو خلیج عقبہ کہتے ہیں اور دوسرے کو خلیج سویز اور یہ دونوں خلیجیں جنوب میں پہنچ کر آپس میں مل جاتی ہیں اور پھر بحیرہ احمر اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔

2۔ اس سے بحر ہند اور بحیرہ احمر کے ملنے کی طرف اشارہ ہے کہ جو باب المندب پر جا ملتے ہیں۔

3۔ یہ بحیرہ روم اور بحر اطلس کے سنگم کی طرف اشارہ ہے کہ جو شہر طنجہ کے پاس جبل الطارق کا تنگ دہانہ ہے۔

تیسری تفسیر تو بہت ہی بعید نظر آتی ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جہاں رہتے تھے وہاں سے جبل الطارق کا فاصلہ اتنا زیادہ

---

[1] سورہ کہف آیت 60

ہے کہ اس زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اگر عام راستے سے وہاں جاتے تو کئی ماہ لگ جاتے۔

دوسری تفسیر میں جس مقام کی نشاندہی کی گئی ہے اس کا فاصلہ اگر چہ نسبتاً کم بنتا ہے لیکن اپنی حد تک وہ بھی زیادہ ہے کیونکہ شام سے جنوبی یمن میں فاصلہ بھی بہت زیادہ ہے۔

پہلا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جہاں رہتے تھے وہاں سے یعنی شام سے خلیج عقبہ تک کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ ویسے بھی قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوئی زیادہ سفر طے نہیں کیا تھا اگر چہ مقصد تک پہنچنے کے لئے بہت زیادہ سفر کے لئے بھی تیار تھے۔

عرصہ دراز تک جناب خضر علیہ السلام کی تلاش

بعض لوگوں نے جناب موسیٰ علیہ السلام کے اس قول کے، کہ انھوں نے کہا: ''میں اس وقت تک کوشش کروں گا نج تک اپنا مقصد حاصل نہ کرلوں'' کے بارے میں کہا ہے: کہ لفظ ''حقب''، ''عرصہ دراز'' کے معنی میں ہے۔ بعض نے اس کی 80 سال سے تفسیر کی ہے۔ اس لفظ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ مجھے جس کی تلاش ہے میں اسے ڈھونڈھ کے رہوں گا چاہے اس مقصد کے لئے مجھے سالہا سال تک سفر جاری رکھنا پڑے۔

''بہر حال جس وقت وہ ان دو دریاؤں کے سنگم پر جا پہنچے تو ایک مچھلی کہ جو ان کے پاس تھی اسے بھول گئے''۔ [1]

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ''مچھلی نے دریا میں اپنی راہ لی اور چلتی بنی''۔ [2]

یہ مچھلی جو ظاہراً ان کے پاس غذا کے طور پر تھی۔ کیا بھونی ہوئی تھی اور اسے نمک لگا ہوا تھا یا یہ تازہ مچھلی تھی کہ جو معجزانہ طور پر زندہ ہو کر اچھل کر پانی میں جا کر تیرنے لگی۔

اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض کتب تفاسیر میں یہ بھی ہے کہ اس علاقے میں آب حیات کا چشمہ تھا۔ اس کے کچھ قطرات مچھلی پر پڑ گئے جس سے مچھلی زندہ ہو گئی۔

لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ مچھلی ابھی پوری طرح مری نہ تھی کیونکہ بعض مچھلیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو پانی سے نکلنے کے بعد بہت دیر تک نیم جاں صورت میں رہتی ہیں اور اس مدت میں پانی میں گر جائیں تو ان کی معمول کی زندگی پھر شروع ہو جاتی ہے۔

آخر کار موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ہمراہی دو دریاؤں کے سنگم سے آگے نکل گئے تو لمبے سفر کے باعث انہیں خستگی کا احساس ہوا اور بھوک بھی ستانے لگی۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام کو یاد آیا کہ غذا تو ہم ہمراہ لائے تھے، لہٰذا انہوں نے اپنے ہمسفر دوست سے کہا: ہمارا کھانا لائیے اس سفر نے تو بہت تھکا دیا ہے۔ [3]

اس وقت ''ان کے ہمسفر نے انہیں خبر دی کہ آپ کو یاد ہے کہ جب ہم نے اس پتھر کے پاس پناہ لی تھی (اور آرام کیا تھا) تو مجھے مچھلی کے بارے میں بتانا یاد نہ تھا اور شیطان ہی تھا جس نے یہ بات مجھے بھلا دی تھی۔ ہوا یہ کہ مچھلی نے بڑے حیران کن طریقے سے دریا کی راہ لی اور پانی میں چلتی بنی''۔ [4]

---

[1] سورہ کہف آیت 61

[2] سورہ کہف آیت 61

[3] سورہ کہف آیت 62

[4] سورہ کہف آیت 63

یہ معاملہ چونکہ موسیٰ علیہ السلام کے لئے اس عالم بزرگ کو تلاش کرنے کے لئے نشانی کی حیثیت رکھتا تھا لہٰذا موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''یہی تو ہمیں جاہئے تھا اور یہی چیز تو ہم ڈھونڈتے پھرتے تھے''۔[1]

''اور اس وقت وہ تلاش کرتے ہوئے اسی راہ کی طرف پلٹے''۔[2]

عظیم استاد کی زیارت

قرآن اس داستان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے: جس وقت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ہمسفر دوست ''مجمع البحرین'' اور پتھر کے پاس پلٹ کر آئے تو ''اچانک ہمارے بندوں میں سے ایک بندے سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ وہ بندہ کہ جس پر ہم نے اپنی رحمت کی تھی اور جسے ہم نے بہت سے علم و دانش سے نوازا تھا''۔[3]

اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بڑے ادب سے اس عالم بزرگ کی خدمت میں عرض کیا: ''کیا مجھے اجازت ہے کہ میں آپ کی پیروی کروں تا کہ جو علم آپ کو عطا کیا گیا ہے اور جو باعث رشد و صلاح ہے، مجھے بھی تعلیم دیں''۔[4] لیکن بڑے تعجب کی بات ہے کہ اس عالم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ''تم میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کرسکو گے''۔[5] ساتھ ہی اس کی وجہ اور دلیل بھی بیان کردی اور کہا: ''تم اس چیز پر کیسے صبر کر سکتے ہو جس کے اسرار سے تم آگاہی نہیں رکھتے''؟[6] جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے یہ عالم، اسرار و حوادث کے باطنی علوم پر دسترس رکھتا تھا جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ باطن پر مامور تھے اور نہ ان کے بارے میں زیادہ آگاہی رکھتے تھے۔

ایسے مواقع پر ایسا بہت ہوتا ہے کہ حوادث کے ظاہر سے ان کا باطن مختلف ہوتا ہے، بعض اوقات کسی واقعے کا ظاہر احمقانہ اور ناپسندیدہ ہوتا ہے جبکہ باطن میں بہت مقدس منطقی اور سوچا سمجھا ہوتا ہے ایسے مواقع پر جو شخص ظاہر کو دیکھتا ہے وہ اس پر صبر نہیں کر پاتا اور اس پر اعتراض کرتا ہے یا مخالفت کرنے لگتا ہے۔

لیکن وہ استاد کہ جو اسراروں سے آگاہ ہے اور معاملے کے باطن پر نظر رکھتا ہے وہ بڑے اطمینان اور ٹھنڈے دل سے کام جاری رکھتا ہے اور اعتراض اور واویلا پر کان نہیں دھرتا بلکہ مناسب موقع کے انتظار میں رہتا ہے تا کہ حقیقت امر بیان کرے جبکہ شاگرد بے تاب رہتا ہے لیکن جب اسرار اس پر کھل جاتے ہیں تو اسے پوری طرح سکون و قرار آجاتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ بات سن کر پریشان ہوئے، انہیں خوف تھا کہ اس عالم بزرگ کا فیض ان سے منقطع نہ ہو لہٰذا انہوں نے وعدہ کیا کہ تمام امور پر صبر کریں گے اور کہا انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی کام میں آپ کی مخالفت نہیں کروں گا۔[7]

---

[1] سورہ کہف آیت 64
[2] سورہ کہف آیت 64
[3] سورہ کہف آیت 65
[4] سورہ کہف آیت 66
[5] سورہ کہف آیت 67
[6] سورہ کہف آیت 68
[7] سورہ کہف آیت 69

یہ کہہ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر انتہائی ادب واحترام اور خدا کی مرضی پر اپنے بھروسے کا اظہار کیا۔

آپ نے اس عالم سے یہ نہیں کہا کہ میں صابر ہوں بلکہ کہتے ہیں: انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔لیکن چونکہ ایسے واقعات پر صبر کرنا کہ جو ظاہراً ناپسندیدہ ہوں اور انسان جن کے اسرار سے آگاہ نہ ہو کوئی آسان کام نہیں اس لئے اس عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خبردار کرتے ہوئے پھر عہد لیا ''اور کہا اچھا اگر تم میرے پیچھے پیچھے آنا چاہتے ہو تو دیکھو خاموش رہنا اور کسی معاملے پر سوال نہ کرنا جب تک کہ مناسب موقع پر میں خود تم سے بیان نہ کردوں''۔ [1]

جناب موسیٰ علیہ السلام نے پھر دوبارہ وعدہ کیا اور استاد کے ساتھ ہو لئے۔

خدائی معلم اور یہ ناپسندیدہ کام؟

''موسیٰ علیہ السلام اس عالم ربانی کے ساتھ چل پڑے۔ چلتے چلتے ایک کشتی تک پہنچے اور اس میں سوار ہو گئے''۔ [2]

یہاں سے ہم دیکھتے ہیں کہ اب قرآن تثنیہ کی ضمیر استعمال کرنے لگا ہے۔ یہ اشارہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اس عالم بزرگوار کی طرف۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمسفر یوشع علیہ السلام کی ماموریت اس مقام پر ختم ہو گئی تھی اور وہ یہاں سے پلٹ گئے تھے یا پھر یہ ہے کہ وہ موجود تو تھے لیکن اس معاملے سے ان کا تعلق نہیں تھا لہٰذا انہیں یہاں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔لیکن پہلا احتمال زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔

''بہرحال وہ دونوں کشتی پر سوار ہو گئے تو اس عالم نے کشتی میں سوراخ کر دیا''۔ [3]

حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ ایک طرف تو اللہ کے عظیم نبی بھی تھے، لہٰذا انہیں لوگوں کی جان و مال کا محافظ بھی ہونا چاہئے تھا اور انہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی کرنا چاہتے تھا اور دوسری طرف ان کا انسانی ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ اس قسم کے غلط کام پر خاموشی اختیار کریں لہٰذا حضرت خضر کے ساتھ ان کا جو معاہدہ ہوا تھا اسے ایک طرف رکھا اور اس کام پر اعتراض کر دیا اور کہا: ''کیا آپ نے اہل کشتی کو غرق کرنے کے لئے اس میں سوراخ کر دیا ہے واقعاً آپ نے کس قدر برا کام انجام دیا ہے''۔ [4]

واقعاً یہ کام کتنا حیرت انگیز ہے کہ کسی کشتی میں بہت سے مسافر سوار ہوں اور اس میں سوراخ کر دیا جائے؟

بعض روایات میں ہے کہ اہل کشتی جلد ہی متوجہ ہو گئے اور انہوں نے اس سوراخ کو کسی چیز کے ذریعے سے پر کر دیا لیکن اب وہ کشتی صحیح نہیں رہ گئی تھی۔

اس وقت اس عالم نے بڑی متانت کے ساتھ موسیٰ پر نگاہ ڈالی اور کہا: ''میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکو گے''۔ [5]

اس واقعے کی اہمیت کے پیش نظر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عجلت اگرچہ فطری تھی تاہم وہ پشیمان ہوئے انہیں اپنا معاہدہ یاد آیا

---

[1] سورہ کہف آیت 70

[2] سورہ کہف آیت 71

[3] سورہ کہف آیت 71

[4] سورہ کہف آیت 71

[5] سورہ صف آیت 72

لہٰذا معذرت آمیز لہجے میں استاد سے ''کہا اس بھول پر مجھ سے مواخذہ نہ کیجئے اور اس کام پر مجھ پر سخت گیری نہ کیجئے''۔[1]

کیوں اس بچے کو قتل کر رہے ہو؟

ان کا دریائی سفر ختم ہو گیا وہ کشتی سے اتر آئے، ''سفر جاری تھا اثنائے راہ میں انہیں ایک بچہ ملا لیکن اس عالم نے کسی تمہید کے بغیر ہی اس بچے کو قتل کر دیا''۔[2]

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پھر نہ رہا گیا یہ نہایت وحشت ناک منظر تھا بلا جواز اور بے وجہ ایک بے گناہ بچے کا قتل، ایسی چیز نہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خاموش رہ سکتے آپ غصے سے آگ بگولہ ہو گئے غم واندوہ اور غصے کا یہ عالم تھا کہ آپ نے پھر اپنے معاہدے کو نظر انداز کرتے ہوئے اب کی شدید تر اور واضح تر اعتراض کیا یہ واقعہ بھی پہلے واقعے کی نسبت زیادہ وحشت ناک تھا وہ کہنے لگے: ''کیا آپ نے ایک بے گناہ اور پاک انسان کو قتل کر دیا ہے جبکہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا، واقعاً آپ نے کیسا برا کام انجام دیا ہے''[3] اس عالم بزرگوار نے پھر اپنے خاص اطمینان اور نرم لہجے میں وہی جملہ دہرایا: ''کہا: میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ تم ہرگز میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے''۔[4]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا عہد یاد آ گیا انہیں بہت احساس شرمندگی ہو رہا تھا کیونکہ دو مرتبہ یہ پیمان ٹوٹ چکا تھا چاہے بھول کر ہی ایسا ہوا ہو انہیں خیال آ رہا تھا کہ ہوسکتا ہے استاد کی بات صحیح ہو کہ انہوں نے تو پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ ابتدا میں ان کے کام موسیٰ کے لئے ناقابل برداشت ہوں گے۔

موسیٰ علیہ السلام نے پھر عذر خواہی کے لہجے میں کہا کہ اس دفعہ بھی مجھ سے صرف نظر کیجئے اور میری بھول چوک کو نظر انداز کر دیجئے اور ''اگر اس کے بعد میں آپ کے کاموں کے بارے میں وضاحت کا تقاضا کروں (اور آپ پر اعتراض کروں) تو پھر بے شک مجھے ساتھ نہ رکھیں اور اس صورت میں آپ میری استادی سے معذور ہوں گے''۔[5]

یہ جملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی انصاف پسندی، بلند نظری اور اعلیٰ ظرفی کی حکایت کرتا ہے اور نشاندہی کرتا ہے کہ وہ ایک حقیقت کے سامنے سر جھکا دینے والے تھے اگرچہ وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔

دوسرے لفظوں میں تین بار کی آزمائش سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ان دونوں کی ماموریت الگ الگ ہے اور اس کا نباہ نہیں ہوسکتا۔

---

[1] سورہ صف آیت 73

[2] سورہ صف آیت 74

[3] سورہ کہف آیت 74

[4] سورہ کہف آیت 75

لفظ ''غلام'' جوان نورس کے معنی میں ہے وہ حد بلوغ کو پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔

جس نوجوان کو اس عالم نے قتل کیا تھا وہ حد بلوغ کو پہنچا ہوا تھا یا نہیں اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

بعض نے ''نفساً زکیۃ'' (پاک اور بے گناہ انسان) کی تعبیر کو اس بات کی دلیل بنایا ہے کہ وہ بالغ تھا کیونکہ قصاص صرف بالغ سے لیا جا سکتا ہے۔ البتہ آیت کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس سلسلے میں حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

[5] سورہ کہف آیت 76

اپنے کام کی مزدوری لے لو

اس گفتگو اور نئے معاہدے کے بعد ''موسیٰ علیہ السلام اپنے استاد کے ساتھ چل پڑے، چلتے چلتے وہ ایک بستی میں پہنچے انہوں نے اس بستی والوں سے کھانا مانگا لیکن بستی والوں نے انہیں مہمان بنانے سے انکار کر دیا''[1]

اس میں شک نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کوئی ایسے افراد نہ تھے کہ اس بستی کے لوگوں پر بوجھ بننا چاہتے تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا زادِ توشہ راستے میں کہیں دے بیٹھے تھے یا پھر ختم ہو گیا تھا لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ بستی والوں کے مہمان ہو جائیں (یہ احتمال بھی ہے کہ اس عالم نے جان بوجھ کر لوگوں سے ایسا کہا ہوتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک اور درس دیا جا سکے)۔[2]

بہر حال مفسرین میں اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ یہ شہر کونسا تھا اور کہاں واقع تھا ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ شہر ''انطاکیہ'' تھا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں ''ایلہ'' شہر مراد ہے کہ جو آج کل ''ایلات'' نام کی مشہور بندرگاہ ہے اور بحیرہ احمر کے کنارے خلیج عقبہ کے نزدیک واقع ہے۔

بعض دوسروں کا نظریہ ہے کہ اس سے ''ناصرہ'' شہر مراد ہے کہ جو فلسطین کے شمال میں واقع ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش ہے۔

مرحوم طبرسی نے اس مقام پر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ جو آخری احتمال کی تائید کرتی ہے۔

مجمع البحرین کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ اس سے مراد ''خلیج عقبہ'' اور ''خلیج سویز'' کا سنگم ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ شہر ناصرہ اور بندرگاہ ایلہ اس جگہ سے انطاکیہ کی نسبت زیادہ قریب ہیں۔

بہر صورت جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے استاد کے ساتھ اس شہر میں پیش آیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کے رہنے والے بہت بخیل اور کم ظرف لوگ تھے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس شہر والوں کے بارے میں ایک حدیث منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: ''وہ کمینے اور کم ظرف لوگ تھے''۔

قرآن کہتا ہے: ''اس کے باوجود انہوں نے اس شہر میں ایک گرتی ہوئی دیوار دیکھی تو اس عالم نے اس کی مرمت شروع کر دی اور اسے کھڑا کر دیا''[3] اور اس کو ویرانی سے بچا لیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وقت تھکے ہوئے تھے انہیں بھوک بھی ستا رہی تھی، کوفت الگ تھی وہ محسوس کر رہے تھے اس آبادی کے ناسمجھ لوگوں نے ان کی اور ان کے استاد کی ہتک کی ہے دوسری طرف وہ دیکھ رہے تھے، اس بے احترامی کے باوجود حضرت خضر علیہ السلام اس گرتی ہوئی دیوار کی تعمیر میں لگے ہوئے تھے جیسے ان کے سلوک کی مزدوری دے رہے ہوں وہ سوچ رہے تھے کہ کم از کم استاد یہ کام اجرت لے کر ہی کرتے تا کہ کھانا تو فراہم ہو جاتا۔

لہٰذا وہ اپنے معاہدے کو پھر بھول گئے انہوں نے پھر اعتراض کیا لیکن اب لہجہ پہلے کی نسبت ملائم اور نرم تھا'' کہنے لگے: اس

---

[1] سورہ کہف آیت 77

[2] اس نکتے کی یاددہانی بھی ضروری ہے کہ ''قریۃ'' قرآن کی زبان میں ایک عام مفہوم رکھتا ہے اور ہر قسم کے شہر اور آبادی کے معنی میں آیا ہے لیکن یہاں خصوصیت سے شہر مراد ہے کیونکہ چند آیات کے بعد اس کے لئے لفظ ''المدینۃ'' (یعنی شہر) آیا ہے۔

[3] سورہ کہف آیت 77

کام کی کچھ اجرت ہی لے لیتے''۔ [1]

درحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ سوچ رہے تھے کہ یہ عدل تو نہیں کہ انسان ان لوگوں سے ایثار کا سلوک کرے کہ جو اس قدر فرومایہ اور کم ظرف ہوں۔ دوسرے لفظوں میں نیکی اچھی چیز ہے مگر جب محل پر ہو، یہ ٹھیک ہے کہ برائی کے جواب میں نیکی کرنا مردان خدا کا طریقہ ہے لیکن وہاں کہ جہاں بروں کے لئے برائی کی تشویق کا باعث نہ ہو۔

فراق دوست، زندگی کے سخت ترین ایام

اس موقع پر اس عالم بزرگوار نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے آخری بات کہی کیونکہ گزشتہ تمام واقعات کی بناء پر انہیں یقین ہو گیا تھا کہ موسیٰ ان کے کاموں کو برداشت نہیں کر سکتے لہٰذا فرمایا: ''لو اب تمہارے اور میرے درمیان جدائی کا وقت آ گیا ہے جلد میں تمہیں ان امور کے اسرار سے آگاہ کروں گا کہ جن پر تم صبر نہ کر سکے''۔ [2]

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہ کیا کیونکہ گزشتہ واقعے میں یہی بات وہ خود تجویز کر چکے تھے یعنی خود حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ حقیقت ثابت ہو چکی تھی کہ ان کا نباہ نہیں ہو سکتا لیکن پھر بھی جدائی کی خبر موسیٰ کے دل پر ہتھوڑے کی ضرب کی طرح لگی ایسے استاد سے جدائی کہ جس کا سینہ مخزن اسرار ہو، جس کی ہمراہی باعث برکت ہو اور جس کی ہر بات ایک درس ہو، جس کا طرز عمل الہام بخش ہو، جس کی پیشانی سے نور خدا ضوفشاں ہو اور جس کا دل علم الٰہی کا گنجینہ ہو ایسے رہبر سے جدائی باعث رنج و غم تھی لیکن یہ ایک ایسی تلخ حقیقت تھی جو موسیٰ کو بہر حال قبول کرنا تھی۔

مشہور مفسر ''ابوالفتوح رازی'' کہتے ہیں کہ ایک روایت منقول ہے:

لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا: آپ کی زندگی میں سب سے بڑی مشکل کونسی تھی؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں نے بہت سختیاں جھیلی ہیں (فرعون کے دور کی سختیاں اور پھر بنی اسرائیل کے دور کی مشکلات کی طرف اشارہ ہے) لیکن کسی مشکل اور رنج نے میرے دل کو اتنا رنجور نہیں کیا جتنا حضرت خضر علیہ السلام سے جدائی کی خبر نے۔

ان واقعات کا راز

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا جدا ہونا طے پا گیا تو ضروری تھا کہ یہ الٰہی استاد اپنے ان کاموں کے اسرار ظاہر کرے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جنہیں گوارا نہیں کر پائے تھے درحقیقت ان سے ہمراہی کا فائدہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے یہی تھا کہ وہ ان تین عجیب واقعات کا راز سمجھ لیں اور یہی راز بہت سے مسائل کی تفہیم کے لئے کلید بن سکتا تھا اور مختلف سوالوں کا جواب اس میں پنہاں تھا۔

حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی والے واقعے سے بات شروع کی اور کہنے لگے: ''ہاں، تو وہ کشتی والی بات یہ تھی کہ وہ چند غریب و مسکین افراد کی ملکیت تھی وہ اس سے دریا میں کام کرتے تھے میں نے سوچا کہ اس میں کوئی نقص ڈال دوں کیونکہ میں جانتا تھا کہ ایک ظالم بادشاہ ان کے پیچھے ہے اور وہ ہر صحیح سالم کشتی کو زبردستی ہتھیا لیتا ہے''۔ [3]

---

[1] سورہ کہف آیت 77

[2] سورہ کہف آیت 78

[3] سورہ کہف آیت 79

گو یا کشتی میں سوارخ کرنا ظاہراً تو برا لگتا تھا لیکن اس کام میں ایک اہم مقصد پوشیدہ تھا اور وہ تھا کشتی کے غریب مالکوں کو ایک غاصب بادشاہ کے ظلم سے بچانا کیونکہ اس کے نزدیک عیب دار کشتیاں اس کے کام کی نہ تھیں اور ایسی کشتیوں پر وہ قبضہ نہیں جما تا تھا خلاصہ یہ کہ یہ کام چند مسکینوں کے مفاد کی حفاظت کے لئے تھا اور اسے انجام پانا ہی چاہئے تھا۔

اس کے بعد حضرت خضر علیہ السلام لڑکے کے قتل کے مسئلے کی طرف آتے ہیں کہتے ہیں: ''رہا وہ لڑکا، تو اس کے ماں باپ صاحب ایمان تھے ہمیں یہ بات اچھی نہ لگی کہ وہ اپنے ماں باپ کو راہ ایمان سے بھٹکا دے اور سرکشی و کفر پر ابھارے۔''[1]

بہر حال اس عالم نے اس لڑکے کو قتل کر دیا اور اس لڑکے کے زندہ رہنے کی صورت میں اس کے ماں باپ کو آئندہ جو ناگوار واقعات پیش آنے والے تھے انہیں اس قتل کی دلیل قرار دیا۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ''ہم نے چاہا کہ ان کا رب ان کو اس کے بدلے زیادہ پاک اور زیادہ پر محبت اولاد عطا فرمائے۔''[2]

آخری اور تیسرے کام یعنی دیوار بنانے کے واقعے کا جواب ہے، اس عالم نے اس واقعے کے راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا: رہی دیوار کی بات۔ تو وہ اس شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی اس دیوار کے نیچے ان کا خزانہ چھپا ہوا تھا اور ان کا باپ ایک نیک اور صالح شخص تھا، تیرا پروردگار چاہتا تھا کہ وہ بالغ ہو جائیں اور اپنا خزانہ نکال لیں، یہ تو تیرے رب کی طرف سے رحمت تھے۔

اور ان کے نیک ماں باپ کی وجہ سے میں مامور تھا کہ اس دیوار کو تعمیر کروں کہ کہیں وہ گر نہ جائے اور خزانہ ظاہر ہو کر خطرے سے دوچار نہ ہو جائے۔[3]

لہٰذا انہوں نے کہا: اور میں نے یہ کام خود سے نہیں کئے بلکہ اللہ کے حکم تحت انجام دیئے۔[4]

جی ہاں: یہ تھے ان کاموں کے راز کہ جن پر صبر کی تم میں تاب نہیں تھی۔[5]

خضر کی ماموریت تشریعی تھی یا تکوینی؟

یہ وہ اہم ترین مسئلہ ہے جس نے بزرگ علماء کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے تین واقعات کہ جو اس عالم کے ہاتھوں انجام پائے ان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کیا کیونکہ وہ باطن امر سے آگاہ نہ تھے لیکن بعد میں استاد نے وضاحت کی تو مطمئن ہو گئے۔

سوال یہ ہے کہ کیا واقعاً کسی کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر نقص پیدا کیا جا سکتا ہے، کہ غاصب اسے لے نہ جائے۔

اور کیا کسی لڑکے کو اس کام پر سزا دی جا سکتی ہے جو وہ آئندہ میں انجام دے گا؟۔

اور کیا ضروری ہے کہ کسی کے مال کی حفاظت کے لئے ہم مفت زحمت برداشت کریں؟

ان سوالات کے جواب میں ہمارے سامنے دو راستے ہیں: پہلا یہ کہ ان امور کو ہم فقہی احکام اور شرعی قوانین کی روشنی میں دیکھیں۔ بعض مفسرین نے یہی راستہ اختیار کیا ہے۔

---

[1] سورہ کہف آیت 80

[2] سورہ کہف آیت 81

[3] سورہ کہف آیت 82

[4] سورہ کہف آیت 82

[5] سورہ کہف آیت 82

انہوں نے پہلے واقعے کو اہم اور اہم تر قوانین پر سمجھا ہے اور کہا ہے کہ مسلم ہے کہ ساری کشتی اور پوری کشتی کی حفاظت اہم کام تھا جبکہ جزوی نقص سے حفاظت زیادہ اہم نہیں تھا دوسرے لفظوں میں حضرت خضر علیہ السلام نے کم نقصان کے ذریعے زیادہ نقصان کو روکا، فقہی زبان میں ''افسد کو فاسد سے دفع کیا'' خصوصاً جبکہ یہ بات ان کے پیش نظر تھی کہ کشتی والوں کی باطن رضامندی انہیں حاصل ہے کیونکہ اگر وہ اصل صورت حال سے آگاہ ہوجاتے تو اس کام پر راضی ہوجاتے (فقہی تعبیر کے مطابق حضرت خضر علیہ السلام کو اس مسئلے میں ''اذن فحوی'' حاصل تھا)۔

اس لڑکے کے بارے میں مفسرین کا اصرار ہے کہ یقیناً وہ بالغ تھا اور وہ مرتد یا فاسد تھا لہٰذا وہ اپنے موجودہ اعمال کی وجہ سے جائز القتل تھا اور یہ جو حضرت خضر اپنے اقدام کے لئے اس کے آئندہ جرائم کو دلیل بناتے ہیں تو وہ اس بناء پر ہے کہ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ مجرم نہ صرف یہ کہ اس وقت اس کام میں مبتلا ہے بلکہ آئندہ بھی اس سے بڑھ کر جرائم کا مرتکب ہوگا لہٰذا اس کا قتل قوانین شریعت کے مطابق تھا اور وہ اپنے افعال اور خود کردہ گناہوں کی وجہ سے جائز القتل تھا۔

رہا تیسرا واقعہ تو کوئی شخص کسی پر یہ اعتراض نہیں کرسکتا کہ تم دوسرے کے لئے کیوں ایثار کرتے ہو اور اس کے اموال کو بچانے کے لئے کیوں بیگار اٹھاتے ہو، ہوسکتا ہے یہ ایثار واجب نہ ہو لیکن مسلم ہے کہ یہ اچھا کام ہے اور لائق تحسین ہے بلکہ ہوسکتا ہے کہ بعض مواقع پر سرحد وجوب تک پہنچ جائے مثلاً کسی یتیم بچے کا بہت سا مال ضائع ہورہا ہو اور تھوڑی سی زحمت کرکے اسے بچایا جاسکے تو بعید نہیں ہے کہ ایسے موقع پر یہ کام واجب ہو۔

دوسرا راستہ اس بنیاد پر ہے کہ مذکورہ بالا توضیحات اگرچہ خزانے اور دیوار کے بارے میں لائق اطمینان ہوں لیکن جو جوان مارا گیا اس کے بارے میں مذکورہ وضاحتیں ظاہر قرآنی گفتگو سے مناسبت نہیں رکھتیں کیونکہ اس کے قتل کا قصد ظاہراً اس کے آئندہ کا عمل قرار دیا گیا ہے نہ کہ موجودہ عمل۔ کشتی کے بارے میں بھی مذکورہ وضاحت کسی حد تک قابل بحث ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ کوئی اور راہ اختیار کی جائے اور وہ یہ ہے: اسی جہان میں ہمیں دو نظاموں سے سابقہ پڑتا ہے ایک نظام تکوین ہے اور دوسرا نظام تشریع یہ دونوں نظام اگرچہ کلی اصول میں تو ہم آہنگ ہیں لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جزئیات میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

مثلاً اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمائش خوف، اموال وثمرات کے نقصان، اپنی اور عزیزوں کی موت اور قتل کے ذریعے کرتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ کون شخص ان حوادث ومصائب پر صبر وشکیبائی اختیار کرتا ہے۔

تو کیا کوئی فقیہ بلکہ کوئی پیغمبر ایسا کرسکتا ہے۔ یعنی اموال ونفوس، ثمرات اور امن کو ختم کرکے لوگوں کو آزمائے؟

یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض نبیوں اور صالح بندوں کو خبردار کرنے اور انہیں تنبیہ کرنے کے لئے کسی ترک اولیٰ پر بڑی مصیبتوں میں گرفتار کرتا ہے جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام مصیبت میں گرفتار ہوئے اس بات پر کہ انہوں نے بعض مساکین کی طرف کم توجہ دی یا حضرت یونس کو ایک معمولی ترک اولیٰ پر مصیبت میں گرفتار ہونا پڑا تو کیا کوئی حق رکھتا ہے کہ کسی کو سزا کے طور پر ایسا کرے یا یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کبھی اللہ تعالیٰ کسی انسان کی ناشکری کی وجہ سے اس سے کوئی نعمت چھین لیتا ہے مثلاً کوئی شخص مال ملنے پر شکر ادا نہیں کرتا تو اس کا مال دریا میں غرق ہوجاتا ہے یا صحت پر شکر ادا نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اس سے صحت لے لیتا ہے تو کیا فقہی اور شرعی قوانین کی رو سے کوئی ایسا کرسکتا ہے کہ ناشکری کی وجہ سے کسی کا مال ضائع کردے اور اس کی مثالیں مجموعی طور پر ظاہر کرتی ہیں کہ جہان آفرینش خصوصا خلقت انسان اس احسن نظام پر استوار ہے کہ اللہ نے انسان کو کمال تک پہنچانے کے لئے کچھ تکوینی قوانین بنائے ہیں کہ جن کی خلاف ورزی سے مختلف نتائج مرتب ہوتے ہیں حالانکہ قانون شریعت کے لحاظ سے ہم ان قوانین پر عمل نہیں

کر سکتے۔

مثلاً کسی انسان کی انگلی ڈاکٹر اس لئے کاٹ سکتا ہے کہ زہر اس کے دل کی طرف سرایت نہ کر جائے لیکن کیا کوئی شخص کسی انسان میں صبر پیدا کرنے کے لئے یا کفران نعمت کی وجہ سے اس کی انگلی کاٹ سکتا ہے؟ (جبکہ یہ بات مسلم ہے کہ خدا ایسا کر سکتا ہے کیونکہ ایسا کرنا نظام احسن کے مطابق ہے)

اب جبکہ ثابت ہو گیا کہ ہم دو نظام رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ دونوں نظاموں پر حاکم ہے تو کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ اللہ ایک گروہ کو نظام تشریعی کو عملی شکل دینے پر مامور کرے اور فرشتوں کے ایک گروہ یا بعض انسانوں کو (مثلاً حضرت خضر کو) نظام تکوین کو عملی شکل دینے پر مامور کرے۔

اللہ تعالیٰ کے نظام تکوین کے لحاظ سے کوئی مانع نہیں کہ وہ کسی نابالغ بچے کو بھی کسی حادثے میں مبتلا کر دے اور اس میں اس کی جان چلی جائے کیونکہ ہو سکتا ہے اس کا وجود مستقبل کے لئے بہت بڑے خطرات کا باعث ہو، نیز کوئی مانع نہیں کہ اللہ مجھے آج کسی سخت بیماری میں مبتلا کر دے، اس طرح سے کہ میں گھر سے باہر نہ نکل سکوں کیونکہ وہ چاہتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس عالم میں مامورین کا ایک گروہ باطن پر مامور ہے اور ایک گروہ ظاہر پر مامور ہے جو باطن پر مامور ہیں ان کے لئے اپنے اصول وضوابط اور پروگرام ہیں اور جو ظاہر پر مامور ہیں ان کے لئے اپنے خاص اصول وضوابط ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان دونوں پروگراموں کا اصلی اور کلی مقصد انسان کو کمال کی طرف لے جانا ہے اس لحاظ سے دونوں ہم آہنگ ہیں، شک نہیں کہ ان دونوں طریقوں میں سے کسی میں بھی کوئی خودسری سے کوئی اقدام نہیں کر سکتا بلکہ ضروری ہے کہ وہ حقیقی مالک وحاکم کی طرف سے مجاز ہو لہٰذا حضرت خضر علیہ السلام نے صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کیا اور کہا:

میں نے یہ کام حکم الٰہی کے مطابق اور اسی کے ضابطے اور طریقہ کے مطابق انجام دیئے ہیں اس طرح ان اقدامات میں جو ظاہری تضاد نظر آتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر کے کاموں کو برداشت نہیں کر پاتے تھے تو یہ اسی بناء پر تھا کہ ان کی ماموریت اور ذمہ داری کا طریقہ جناب خضر علیہ السلام کی ذمہ داری کے راستے سے الگ تھا لہٰذا جب انہوں نے حضرت خضر کا کام ظاہراً شرعی قوانین کے خلاف دیکھا تو اس پر اعتراض کیا لیکن خضر نے ٹھنڈے دل سے اپنا کام جاری رکھا اور چونکہ یہ دو عظیم خدائی رہبر مختلف ذمہ داریوں کی بناء پر ہمیشہ کے لئے اکٹھے نہیں رہ سکتے تھے لہٰذا حضرت خضر نے کہا:

''یہ اب میرے اور تمہارے جدا ہونے کا مرحلہ آ گیا ہے''۔

حضرت خضر علیہ السلام کون تھے؟

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا نام صراحت کے ساتھ قرآن میں نہیں لیا گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دوست اور استاد کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ''ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ جسے ہم نے اپنی رحمت عطا کی اور جسے ہم نے اپنے علم سے نوازا''۔ اس تعارف میں ان کے مقام عبودیت کا تذکرہ ہے اور ان کے خاص علم کو واضح کیا گیا ہے لہٰذا ہم نے بھی عالم کے طور پر ان کا زیادہ ذکر کیا ہے۔

لیکن متعدد روایات میں اس عالم کا نام ''خضر'' بتایا گیا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اصلی نام ''بلیا ابن ملکان'' تھا اور ''خضر'' ان کا لقب تھا کیونکہ وہ جہاں کہیں قدم رکھتے ان کے قدموں کی بدولت زمین سرسبز ہو جاتی تھی۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس عالم کا نام ''الیاس'' ہے یہی سے یہ تصور پیدا ہوا کہ ہوسکتا ہے ''الیاس'' اور ''خضر'' ایک ہی شخص کے دو نام ہوں لیکن مشہور و معروف مفسرین اور راویوں نے پہلی بات ہی بیان کی ہے۔

واضح ہے کہ یہ بات کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی کہ اس شخص کا نام کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ ایک عالم ربانی تھے اور پروردگار کی خاص رحمت ان کے شامل حال تھی۔ وہ باطن اور نظام تکوینی پر مامور تھے اور کچھ اسرار سے آگاہ تھے اور ایک لحاظ سے موسیٰ علیہ السلام بن عمران کے معلم تھے اگر چہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کئی لحاظ سے ان پر مقدم تھے۔

یہ کہ وہ پیغمبر تھے یا نہیں۔ اس سلسلے میں روایات مختلف ہیں۔ اصول کافی جلد اول میں متعدد روایات ہیں کہ جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ پیغمبر نہیں تھے بلکہ وہ ''ذوالقرنین'' اور ''آصیف ابن برخیا'' کی طرح ایک عالم تھے۔

جبکہ کچھ اور روایات ایسی بھی ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مقام نبوت کے حامل تھے اور زیر نظر روایات میں بھی بعض تعبیرات کا ظاہری مفہوم بھی یہی ہے۔ کیونکہ ایک موقع پر وہ کہتے ہیں:

''میں نے یہ کام اپنی طرف سے نہیں کیا''۔

ایک اور مقام پر کہتے ہیں: ''ہم چاہتے تھے کہ ایسا ہو''۔

نیز بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک لمبی عمر کے حامل تھے۔

خودساختہ افسانے

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی داستان کی بنیاد وہی ہے کہ جو کچھ قرآن میں آیا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس سے منسلک کر کے بہت سے افسانے گھڑ لئے گئے ہیں۔ ان افسانوں کو اس داستان کے ساتھ خلط ملط کرنے سے اصل داستان کی صورت بھی بگڑ جاتی ہے۔ جاننا چاہئے کہ یہ کوئی پہلی داستان نہیں ہے کہ جس کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا ہے اور بہت سی سچی داستانوں کے ساتھ یہی حال کیا گیا ہے۔

لہٰذا حقیقت تک رسائی کے لئے قرآن کو بنیاد قرار دیا جانا چاہئے جس میں یہ داستان بیان ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ احادیث کو بھی اسی صورت میں قبول کیا جا سکتا ہے جب وہ قرآن کے موافق ہوں۔ اگر کوئی حدیث اس کے برخلاف ہو تو یقیناً وہ قابل قبول نہیں ہے اور خوش قسمتی سے معتبر احادیث میں ایسی کوئی حدیث نہیں ہے۔

علم موسیٰ علیہ السلام و خضر علیہ السلام، علم خدا کے مقابلہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

''جس وقت موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام سے ملے تو ایک پرندہ ان کے سامنے ظاہر ہوا۔ اس نے پانی کا ایک قطرہ اپنی چونچ میں لیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خضر علیہ السلام نے کہا:

جانتے ہو کہ پرندہ کیا کہتا ہے: گیارہویں صدی عیسوی میں مدون ہوئی ہیں، ان میں ایک داستان نقل ہوئی ہے کہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مذکورہ داستان سے کچھ مشابہت رکھتی ہے۔ اگر چہ اس داستان کے ہیرو ''الیاس'' اور ''یوشع بن لاوی'' ہیں کہ جو تیسری صدی عیسوی کے ''تلمود'' کے مفسرین میں سے تھے۔ یہ داستان اور کئی پہلوؤں سے بھی موسیٰ علیہ السلام و خضر علیہ السلام سے مختلف ہے۔

مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ ج 7 ص 171 پر رجوع کریں۔

موسیٰ علیہ السلام نے کہا: کیا کہتا ہے؟

خضر علیہ السلام کہنے لگے: کہتا ہے: ''تیرا علم اور موسیٰ کا علم، خدا کے علم کے مقابلے میں اس قطرے کی طرح ہے جو میں نے پانی سے چونچ میں لیا ہے''۔

وہ خزانہ کیا تھا؟

اس داستان کے بارے میں ایک سوال اور بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ خزانہ آخر کیا تھا جسے موسیٰ علیہ السلام کے عالم دوست پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے اور آخر اس باایمان شخص یعنی یتیموں کے باپ نے یہ خزانہ کیوں چھپا دیا تھا؟

بعض نے کہا ہے کہ وہ خزانہ مادی پہلو کی بجائے زیادہ معنوی پہلو رکھتا تھا۔ بہت سی شیعہ سنی روایات کے مطابق وہ ایک تختی تھی جس پر حکمت آمیز کلمات نقش تھے۔ اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ وہ حکمت آمیز کلمات کیا تھے۔

کتاب کافی میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

یہ سونے چاندی کا خزانہ نہیں تھا۔ یہ تو صرف ایک تختی تھی جس پر چار جملے ثبت تھے۔

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

جو موت پر یقین رکھتا ہے وہ (بے ہودہ) نہیں ہنستا۔

اور جسے اللہ کی طرف سے حساب کا یقین ہے (اور اسے جوابدہی کی فکر ہے) وہ خوش نہیں رہتا۔

اور جسے تقدیر الٰہی کا یقین ہے وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔

اور بنی اسرائیل کی نافرمانی اصحاب سبت، سنیچر کی چھٹی

بنی اسرائیل کا ایک گروہ جو ایک سمندر (بظاہر بحیرہ احمر جو فلسطین کے پاس ہے) کے کنارے شہر ''ایلہ'' (جسے آج کل ''ایلات'' کہتے ہیں) میں رہتے تھے، ان کی آزمائش کے لئے اللہ نے انہیں حکم دیا تھا کہ ہفتہ کے روز مچھلی کا شکار نہ کریں، سارے دنوں میں شکار کریں صرف ایک دن تعطیل کر دیا کریں لیکن ان لوگوں نے اس حکم کی صریحاً مخالفت کی جس کے نتیجے میں وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہوئے جس کی تفصیل قرآن میں بیان کی گئی ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: ''جو یہودی تمہارے زمانہ میں موجود ہیں ان سے اس شہر کے ماجرے کے متعلق سوال کرو جو سمندر کے کنارے آباد تھا''۔ اور انہیں وہ زمانہ یاد دلاؤ جبکہ وہ ہفتہ کے روز قانون الٰہی کی مخالفت کرتے تھے۔''[1]

کیونکہ ہفتہ کے روز ان کی تعطیل کا دن تھا جس میں ان کو یہ حکم ملا تھا کہ اس روز وہ اپنا کاروبار ترک کر دیں اور عبادت خدا میں مشغول ہوں لیکن انہوں نے اس حکم کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

اس کے بعد قرآن کریم اس جملے کی جو اجمالی طور پر پہلے گزر چکا ہے اس طرح شرح کرتا ہے کہ یاد کرو: ''جب ہفتہ کے دن مچھلیاں پانی کے اوپر ظاہر ہوتی تھیں اور دوسرے دنوں میں وہ کم دکھلائی دیتی تھیں''۔[2]

یہ بات واضح ہے کہ جو لوگ سمندر کے کنارے زندگی بسر کرتے تھے ان کی خوراک اور آمدنی کا بڑا ذریعہ مچھلی کا شکار ہوتا ہے، اور چونکہ ہفتہ کے روز مسلسل تعطیل ان کے درمیان رائج تھی، لہٰذا اس روز مچھلیاں امن محسوس کرتی تھیں اور وہ گروہ در گروہ پانی کی

---

[1] سورہ اعراف آیت 162

[2] سورہ اعراف آیت 162

سطح پر ظاہر ہوتی تھیں لیکن دوسرے دنوں میں چونکہ ان کا شکار کیا جاتا تھا اس لئے وہ گہرے پانی میں بھاگ جاتی تھیں۔ بہرحال یہ کیفیت چاہے کسی فطری امر کے نتیجہ میں ہو یا کوئی خلاف معمول الٰہی بات ہو اس سے ان لوگوں کی آزمائش مطلوب تھی جیسا کہ قرآن بیان کرتا ہے:

''ہم نے اس طرح ان لوگوں کی آزمائش کی اس چیز کے ذریعے جس کی وہ مخالفت کرتے تھے''۔[1]

جس وقت بنی اسرائیل اس بڑی آزمائش سے دوچار ہوئے جو ان کی زندگی کے ساتھ وابستہ تھی تو وہ تین گروہوں میں بٹ گئے:

اول: جن کی اکثریت تھی، وہ لوگ تھے جنہوں نے اس فرمان الٰہی کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔

دوم: جو حسب معمولی ایک چھوٹی اقلیت پر مشتمل تھا وہ گروہ اول کے مقابلے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شرعی ذمہ داری ادا کرتا تھا۔

سوم: یہ وہ لوگ تھے جو ساکت اور غیر جانبدار تھے۔ یہ نہ تو گنہگاروں کے ساتھ تھے اور نہ انہیں گناہوں سے منع کرتے تھے۔

قرآن میں اس گروہ نے دوسرے گروہ سے جو گفتگو کی ہے اسے نقل کیا گیا ہے۔

اس وقت کو یاد کرو جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے سے کہا: تم ان لوگوں کو کیوں وعظ و نصیحت کرتے ہو جنہیں آخر کار خدا ہلاک کرنے والا ہے یا دردناک عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے۔

انہوں نے جواب میں کہا: ہم اس لئے برائی سے منع کرتے ہیں کہ خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کو ادا کر دیں اور وہ اس بارے ہیں ہم سے کوئی باز پرس نہ کرے۔

علاوہ ازیں شاید ان کے دلوں میں ہماری باتوں کا کوئی اثر بھی ہو جائے اور وہ طغیان و سرکشی سے ہاتھ اٹھا لیں۔[2]

''آخر کار دنیا پرستی نے ان پر غلبہ کیا۔ اور انہوں نے خدا کے فرمان کو فراموش کر دیا۔ اس وقت ہم نے ان لوگوں کو جو لوگوں کو گناہ سے منع کرتے تھے، نجات دی، لیکن گناہگاروں کو ان کے گناہ کے سبب سخت عذاب میں مبتلا کر دیا''۔[3]

اس کے بعد انہیں سزا دیئے جانے کی کیفیت اس طرح بیان فرمائی گئی ہے: ''انہوں نے اس بات کے مقابلے میں سرکشی کی جس سے انہیں روکا گیا تھا۔ (لہٰذا) ہم نے ان سے کہا دھتکارے ہوئے بندروں کی شکل میں ہو جاؤ''۔[4]

بنی اسرائیل نے کس طرح گناہ کیا تھا؟

اس امر میں کہ بنی اسرائیل نے کس وقت قانون شکنی کی، مفسرین کے درمیان بحث ہے۔ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ایک حیلہ اختیار کیا، انہوں نے سمندر کے کنارے بہت سے حوض بنا لئے تھے اور انہیں نہروں کے ذریعے سمندر سے ملا دیا تھا۔ ہفتہ کے روز ان حوضوں کے راستے کھول دیتے تھے پانی کے ساتھ مچھلیاں ان حوضوں کے اندر آ جاتی تھیں، غروب کے وقت جب

---

[1] سورہ اعراف آیت 163

[2] سورہ اعراف آیت 164

[3] سورہ اعراف آیت 165

[4] سورہ اعراف آیت 166

واپس جانا چاہتی تھیں تو واپسی کا راستہ بند کر دیتے تھے، جب اتوار کا دن ہوتا تھا تو پھر ان کا شکار کر لیتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ ہم نے ہفتہ کے روز شکار تھوڑی کیا ہے بلکہ ہم نے تو صرف انہیں حوضوں میں محصور کر لیا تھا اصل شکار تو اتوار کے روز ہوا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ وہ لوگ ہفتہ کے روز مچھلی پکڑنے کے کانٹوں کو دریا میں ڈال دیتے تھے اس کے بعد جب اس میں مچھلیاں پھنس جاتی تھیں تو دوسرے روز انہیں نکال لیتے تھے اور اس حیلہ سے ان کا شکار کرتے تھے۔

بعض روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ بغیر کسی حیلہ کے بروز شنبہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ شکار میں مشغول ہوتے تھے۔

ممکن ہے کہ یہ تمام روایات صحیح ہوں اس طرح کہ ابتداء میں حوضوں یا قلابوں کے ذریعے حیلے سے شکار کرتے ہوں، جب اس طرح سے ان کی نظر میں گناہ کی اہمیت کم ہوگئی ہو تو پھر انہوں نے اعلانیہ گناہ کرنا شروع کر دیا ہو اور ہفتہ کے دن کی حرمت کو ضائع کر کے مچھلی کی تجارت سے مالدار ہو گئے ہوں۔[1]

بنی اسرائیل کی گائے کا واقعہ

بنی اسرائیل میں سے ایک شخص نامعلوم طور پر قتل ہو جاتا ہے۔ اس کے قاتل کا کسی طرح پتا نہیں چلتا۔

تاریخ اور تفاسیر سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ قتل کا سبب مال تھا یا شادی۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک ثروت مند شخص تھا۔ اس کے پاس بے پناہ دولت تھی۔ اس دولت کا وارث اس کے چچازاد بھائی کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ وہ دولت مند کافی عمر رسیدہ ہو چکا تھا۔ اس کے چچازاد بھائی نے بہت انتظار کیا کہ وہ دنیا سے چلا جائے تا کہ اس کا وارث بن سکے لیکن اس کا انتظار بے نتیجہ رہا لہٰذا اس نے اسے ختم کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ بالآخر اسے تنہائی میں پا کر قتل کر دیا اور اس کی لاش سڑک پر رکھ دی اور گریہ وزاری کرنے لگا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بارگاہ میں مقدمہ پیش کیا کہ بعض لوگوں نے میرے چچازاد بھائی کو قتل کر دیا ہے۔

بنابریں اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں کہ کلمہ ''مسخ'' کا جو ظاہری مفہوم ہے اسی کو مانا جائے جو قرآن میں آیا ہے نیز دیگر

---

[1] آیا یہ مسخ جسمانی تھا یا روحانی؟

''مسخ'' یا دوسرے لفظوں میں ''انسانی شکل کا کسی حیوان کی شکل میں تبدیل ہو جانا'' مسلمہ طور پر ایک خلاف معمول اور خلاف طبیعت بات ہے اگر چہ میوٹیشن (mutation) بعض حیوانات کا دوسرے حیوانات کی شکل اختیار کر لینا نادر طور پر دیکھا گیا ہے اور سائنس میں تکامل حیات کی بنیاد بھی اس بات پر رکھی گئی ہے، لیکن میوٹیشن (mutation) جہاں دیکھا گیا ہے وہ بہت نادر الموقع موارد ہیں، وہ بھی حیوانات کی جزوی صفات میں پایا جاتا ہے نہ کہ ان کی کلی صفات میں، بلکہ ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ میوٹیشن (mutation) کی وجہ سے ایک حیوان اپنی نوع مثلاً بندر سے بکری بن گیا ہو۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی حیوان کی خصوصیات دگرگوں ہو جائیں، پھر یہ کہ یہ تبدیلی اس کی نسل میں پیدا ہوتی ہے نہ کہ جو حیوان پیدا ہو گیا ہے اس کی شکل یک بیک بدل گئی ہو، بنابرایں کسی انسان یا حیوان کی شکل کا بدل کر دوسری نوع اختیار کر لینا ایک خلاف معمول بات ہے۔

ہم نے بارہا یہ بات کہی ہے کہ کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جو طبیعت اور عادت کے برخلاف واقع ہوتے ہیں جو کبھی تو پیغمبروں کے معجزوں کی صورت میں اور کبھی بعض خارق العادت کاموں کی صورت میں بعض انسانوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔

چاہے وہ انسان پیغمبر نہ بھی ہوں (ایسے افعال میں اور معجزات میں فرق ہوتا ہے) لہٰذا جب خارق العادت امور اور معجزات کے وقوع کو قبول کر لیا جائے تو مسخ ہو جانا یا ایک انسان کا دوسرے انسان کی صورت اختیار کر لینا کوئی خلاف عقل بات نہیں ہے۔

اس طرح کا خارق العادت واقعہ رونما ہونا نہ تو قانون علل و اسباب میں کوئی مستثنیٰ ہے اور نہ ہی عقل و خرد کے برخلاف بلکہ اس میں صرف ایک ''عادی'' طبیعی کلیہ کی شکست ہے جس کی نظیر ہم نے بعض استثنائی انسانوں میں بارہا دیکھی ہے۔

مفسرین نے بھی زیادہ تر یہی معنی مراد لئے ہیں۔

بعض دیگر مفسرین کہتے ہیں کہ قتل کا سبب یہ تھا کہ اپنے چچازاد بھائی کو قتل کرنے والے نے اس سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا تھا لیکن اس نے یہ درخواست رد کردی اور لڑکی کو بنی اسرائیل کے ایک نیک اور پاکباز جوان سے بیاہ دیا۔شکست خوردہ چچازاد بھائی نے لڑکی کے باپ کو قتل کرنے کا ارادہ کرلیا اور چھپ کر اسے قتل کردیا۔

بنی اسرائیل کے قبائل کے درمیان جھگڑا اور نزاع شروع ہوجاتا ہے۔ان میں سے ہر ایک دوسرے قبیلے اور دیگر لوگوں کو اس کا ذمہ دار گردانتا ہے اور اپنے کو بری الذمہ قرار دیتا ہے۔

جھگڑا ختم کرنے کے لئے مقدمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور لوگ آپ سے اس موقع پر مشکل کشائی کی درخواست کرتے ہیں اور اس کا حل چاہتے ہیں۔

چونکہ عام اور معروف طریقوں سے اس قضیہ کا فیصلہ ممکن نہ تھا اور دوسری طرف اس کشمکش کے جاری رہنے سے ممکن تھا بنی اسرائیل میں ایک عظیم فتنہ کھڑا ہوجاتا۔

لہٰذا جیسا کہ آپ ان آنے والی ابحاث میں پڑھیں گے حضرت موسیٰ علیہ السلام پروردگار سے مدد لے کر اعجاز کے راستے اس مشکل کو کیونکر حل کرتے ہیں۔

قرآن نے فرمایا:''یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا (قاتل کو تلاش کرنے کے لئے) پہلی گائے (جو تمہیں مل جائے اس) کو ذبح کرو''۔[1]

اور اس ذبح شدہ گائے کا ایک حصہ اس مقتول کے جسم پر لگاؤ جس کا قاتل معلوم نہیں ہے تاکہ وہ زندہ ہوجائے اور اپنے قاتل کو بتائے۔

انہوں نے بطور تعجب کہا:''کیا تم ہم سے تمسخر کرتے ہو''۔

موسیٰ علیہ السلام نے ان کے جواب میں کہا:''میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں میں سے ہوجاؤں''۔[2]

یعنی استہزاء اور تمسخر کرنا نادان افراد اور جاہل افراد کا کام ہے۔اور خدا کا رسول یقیناً ایسا نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کے اعتراضات

اسکے بعد انہیں اطمینان ہوگیا کہ استہزاء مذاق نہیں بلکہ سنجیدہ گفتگو ہے تو'' کہنے لگے: اب اگر ایسا ہی ہے تو اپنے پروردگار سے کہیئے ہمارے لئے مشخص و معین کرے کہ وہ گائے کس قسم کی ہو''؟[3]

بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا:

''خدا فرماتا ہے ایسی گائے ہو جو نہ بہت بوڑھی ہو کہ بے کار ہوچکی ہو اور نہ ہی جوان بلکہ ان کے درمیان ہو''۔[4]

اس مقصد سے کہ وہ اس سے زیادہ اس مسئلے کو طول نہ دیں اور بہانہ تراشی سے حکم خدا میں تاخیر نہ کریں اپنے کلام کے آخر

---

[1] سورہ بقرہ آیت 67

[2] سورہ بقرہ آیت 67

[3] سورہ بقرہ آیت 68

[4] سورہ بقرہ آیت 68

میں مزید کہا: ''جو تمہیں حکم دیا گیا ہے۔

(جتنی جلدی ہو سکے) اسے انجام دو''۔[1]

لیکن انہوں نے پھر بھی زیادہ باتیں بنانے اور ڈھٹائی دکھانے سے ہاتھ نہیں اٹھایا اور کہنے لگے:

''اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ وہ ہمارے لئے واضح کرے کہ اس کا رنگ کیسا ہو''۔[2]

موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں کہا: وہ گائے ساری کی ساری زرد رنگ کی ہو جس کا رنگ دیکھنے والوں کو بھلا لگے۔

خلاصہ یہ کہ وہ گائے مکمل طور پر خوش رنگ اور چمکیلی ہو۔ ایسی دیدہ زیب کہ دیکھنے والوں کو تعجب میں ڈال دے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اس پر بھی اکتفاء نہ کیا اور اسی طرح ہر مرتبہ بہانہ جوئی سے کام لے کر اپنے آپ کو اور مشکل میں ڈالتے گئے۔

پھر کہنے لگے: ''اپنے پروردگار سے کہیئے کہ ہمیں واضح کرے کہ یہ گائے (کام کرنے کے لحاظ سے) کیسی ہونی چاہئے کیونکہ یہ گائے ہمارے لئے مبہم ہو گئی ہے''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر سے کہا: ''خدا فرماتا ہے وہ ایسی گائے ہو جو اتنی سدھائی ہوئی نہ ہو کہ زمین جوتے اور کھیتی سینچے، ہر عیب سے پاک ہو، حتیٰ کہ اس میں کسی قسم کا دوسرا رنگ نہ ہو''۔

اب کہ بہانہ سازی کے لئے ان کے پاس کوئی سوال باقی نہ تھا جتنے سوالات وہ کر سکتے تھے۔ سب ختم ہو گئے تو کہنے لگے: ''اب تو نے حق بات کہی ہے''۔ ''پھر جس طرح ہو سکا انہوں نے وہ گائے مہیا کی اور اسے ذبح کیا لیکن دراصل وہ یہ کام کرنا نہیں چاہتے تھے''۔

''پھر ہم نے کہا کہ اس گائے کا ایک حصہ مقتول پر مارو''۔ (تا کہ وہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کا تعارف کرائے)[3]

بنی اسرائیل نے ان خصوصیات کی گائے تلاش کی اور اس کو ذبح کیا اور اس کا خون مقتول کے جسم پر لگایا تو وہ زندہ ہو گیا اور اپنے قاتل (جو اس کا چچازاد بھائی تھا) کی شناخت کرادی۔

باپ سے نیکی کا صلہ

اس قسم کی گائے اس علاقے میں ایک ہی تھی، بنی اسرائیل نے اسے بہت مہنگے داموں خریدا تھا کہتے ہیں اس گائے کا مالک ایک انتہائی نیک آدمی تھا جو اپنے باپ کا بہت احترام کرتا تھا۔

ایک دن جب اس کا باپ سویا ہوا تھا اسے ایک نہایت نفع بخش معاملہ درپیش آیا، صندوق کی چابی اس کے باپ کے پاس تھی لیکن اس خیال سے کہ تکلیف اور بے آرامی نہ ہو اس نے اسے بیدار نہ کیا لہٰذا اس معاملے سے صرف نظر کر لیا۔

بعض مفسرین کے نزدیک بیچنے والا ایک جنس ستر ہزار میں اس شرط پر بیچنے کو تیار تھا کہ قیمت فوراً ادا کی جائے اور قیمت کی ادائیگی اس بات پر موقوف تھی کہ خریدنے کے لئے اپنے باپ کو بیدار کر کے صندوقوں کو چابیاں اس سے حاصل کرے، وہ ستر ہزار میں خریدنے کو تیار تھا لیکن کہتا تھا کہ قیمت باپ کے بیدار ہونے پر ہی دوں گا، خلاصہ یہ کہ سودا نہ ہو سکا، خداوند عالم نے اس نقصان اور کمی

---

[1] سورہ بقرہ آیت 68

[2] سورہ بقرہ آیت 69

[3] سورہ بقرہ آیت 69 تا 73

کو اس طرح پورا کیا کہ اس جوان کے لئے گائے کی فروخت کا یہ نفع بخش موقع فراہم کیا، بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ باپ بیدار ہوا تو اسے واقعہ سے آگاہی ہوئی، اس نیکی کی وجہ سے اس نے وہ گائے اپنے بیٹے کو بخش دی اس طرح اسے وہ بے پناہ نفع میسر ہوا۔

اور مالدار شخص قارون، بنی اسرائیل کا مغرور

یہاں پر گفتگو بنی اسرائیل کے ایک اور مسئلے اور الجھن کی طرف جاتی ہے مسئلہ یہ ہے کہ ان میں ایک سرکش سرمایہ دار تھا اس کا نام قارون تھا جو غرور و سرکشی میں مست کر دینے والی دولت کا مظہر تھا، اصولی طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی میں تین متجاوز طاغوتی طاقتوں کے خلاف جہاد کیا ایک فرعون تھا جو حکومت و اقتدار کا مظہر تھا، دوسرا قارودن تھا جو ثروت و دولت کا مظہر تھا اور تیسرا سامری تھا کہ جو مکر و فریب کا مظہر تھا اگر چہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سب سے بڑا معرکہ حکومت کے خلاف تھا لیکن دوسرے معرکہ بھی اہم تھے اور وہ بھی عظیم تربیتی نکات کے حامل ہیں۔

مشہور ہے کہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قریبی رشتہ دار تھا (چچا، یا چچازاد بھائی یا خالہ زاد بھائی) اس نے توریت کا خوب مطالعہ کیا تھا پہلے وہ مومنین کی صف میں تھا لیکن دولت کا گھمنڈ اسے کفر کی آغوش میں لے گیا اور اسے زمین میں غرق کر دیا اس غرور نے اسے پیغمبر خدا کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا اور اس کی موت سب کے لئے باعث عبرت بن گئی۔ ارشاد ہوتا ہے:

''قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا لیکن اس نے ان پر ظلم کیا''۔ [1]

اس ظلم کا سبب یہ تھا کہ اس نے بہت سی دولت کمالی تھی اور چونکہ وہ کم ظرف تھا اور ایمان مضبوط نہ تھا اس لئے فراواں دولت نے اسے بہکا دیا اور اسے انحراف و استکبار کی طرف لے گئی۔

قرآن کہتا ہے: ''ہم نے اسے مال و دولت کے اتنے خزانے دیے کہ انہیں اٹھانا ایک طاقتور گروہ کے لئے بھی مشکل تھا''۔ [2]

قارون کے پاس اس قدر سونا چاندی اور قیمتی اموال تھے کہ ان کے صندوقوں کو طاقتور لوگوں کا ایک گروہ بڑی مشکل سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے کر جاتا تھا۔

چار نصیحتیں

آیئے اس بحث سے آگے بڑھیں اور دیکھیں کہ بنی اسرائیل نے قارون سے کیا کہا: قرآن کہتا ہے: ''اس وقت کو یاد کرو جب اس کی قوم نے اس سے کہا: تم میں ایسی خوشی نہیں ہونی چاہئے جس میں تکبر اور غفلت ہو کیونکہ خدا غرور میں ڈوبے ہوئے خوشحال افراد کو پسند و نصیحت نہیں کرتا''۔ [3]

اس کے بعد چار اور قیمتی، سرنوشت ساز اور تربیتی نصیحتیں کرتے ہیں اس طرح کل پانچ ہو گئیں۔

پہلے کہتے ہیں: ''اللہ نے جو کچھ تجھے دیا ہے اس سے دار آخرت حاصل کر''۔ [4]

---

[1] سورہ قصص آیت 76

[2] سورہ قصص آیت 76

[3] سورہ قصص آیت 76

[4] سورہ قصص آیت 77

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بعض کج فہم افراد کے خیال کے برخلاف مال و دولت کوئی بری چیز نہیں ہے اہم بات یہ ہے کہ وہ کس راستے پر صرف ہو رہا ہے اگر اس کے ذریعے دار آخرت کو تلاش کیا جائے تو پھر اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ غرور، غفلت، ظلم و تجاوز اور ہوس پرستی کا ذریعہ بن جائے تو پھر اس سے بدتر بھی کوئی چیز نہیں۔

دوسری نصیحت انہوں نے مزید کی: ''دنیا سے اپنے حصے کو نہ بھول جا''۔[1]

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان کا اس دنیا میں ایک محدود حصہ ہے یعنی وہ مال جو اس کے بدن، لباس اور مکان کے لئے درکار ہوتا ہے اور ان پر صرف ہوتا ہے اس کی مقدار معین ہے اور ایک خاص مقدار سے زیادہ اس کے لئے قابل جذب ہی نہیں ہوتا۔

انسان کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے۔

تیسری نصیحت یہ ہے: ''جیسے خدا نے احسان کیا ہے تو بھی نیکی کر''۔[2]

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان ہمیشہ اللہ کے احسان پر نظر لگائے ہوئے ہے اور اس کی بارگاہ سے ہر خیر کا تقاضا کر رہا ہے اور اسی سے ہر قسم کی توقع باندھے ہوئے ہے تو اس طرح سے وہ کیونکر کسی کے صریح تقاضے کو یا زبان حال کے تقاضا کو نظر انداز کر سکتا ہے اور اس سے کیسے بے اعتنائی برت سکتا ہے۔

آخر میں چوتھی نصیحت یہ ہے: ''کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مادی وسائل تجھے دھوکہ دیں اور تو انہیں گناہ اور دعوت گناہ میں صرف کر دے، زمین میں ہرگز گناہ و فساد نہ کر کیونکہ اللہ مفسدین کو پسند نہیں کرتا''۔[3]

صحیح طور پر معلوم نہیں کہ نصیحت کرنے والے یہ افراد کون تھے۔

البتہ یہ بات مسلم ہے کہ وہ اہل علم، پرہیزگار، زیرک بابصیرت اور جرأت مند افراد تھے۔

قارون کا جواب

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس سرکش و ستمگر بنی اسرائیل نے ان ہمدرد واعظین کو کیا جواب دیا۔

قارون تو اپنی اس بے حساب دولت کے نشے میں چور تھا اس نے اسی غرور سے کہا: ''میں نے یہ سب دولت اپنے علم و دانش کے بل بوتے پر حاصل کی ہے''۔[4]

تمہیں اس سے کیا کہ میں اپنی دولت کیسے خرچ کرتا ہوں، جو میں نے کمایا اسے خود کمایا ہے تو پھر صرف کرنے میں بھی مجھے تمہاری راہنمائی کی کوئی ضرورت نہیں۔

علاوہ ازیں خدا مجھے اس دولت کے لائق سمجھتا تھا تبھی تو اس نے مجھے عطا کی ہے اور اسے صرف کرنے کی راہ بھی اس نے مجھے بتائی ہے میں دوسروں سے بہتر جانتا ہوں۔ تمہیں اس میں دخیل ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان سب باتوں سے قطع نظر زحمت میں نے کی ہے، تکلیف میں نے اٹھائی ہے، خون جگر پیا ہے تب کہیں یہ دولت جمع کی ہے، دوسروں کے پاس بھی ایسی لیاقت و توانائی ہوتی تو وہ زحمت و کوشش کیوں نہ کرتے۔ میں نے کوئی ان کا راستہ تو نہیں روک رکھا اور اگر ان میں اس کی لیاقت نہیں ہے تو پھر کیا ہی اچھا ہے

---

[1] سورہ قصص آیت 77

[2] سورہ قصص آیت 87

[3] سورہ قصص آیت 77

[4] سورہ قصص آیت 78

کہ بھوکے رہیں اور مر جائیں۔

یہی وہ بوسیدہ اور گھٹیا منطق ہے کہ جو عام طور پر بے ایمان سرمایہ دار نصیحت کرنے والوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن نے اس باب کو اجمالاً بیان کیا ہے کہ قارون کس علم کے بل پر دولت جمع کرتا تھا۔ کیا وہ علم کیمیاء تھا، جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے یا پھر تجارت، زراعت، اور صنعت کا علم تھا یا پھر کیا وہ انتظامی صلاحیت اور علم کا حامل تھا یا یہ سب امور تھے۔

بعید نہیں کہ قرآن کا مفہوم وسیع ہو اور یہ ان سب امور کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔ (قطع نظر اس کے کہ اس بات میں کتنی حقیقت ہے کہ علم کیمیا کے ذریعے تانبے وغیرہ کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔)

اس موقع پر قرآن قارون اور اس جیسے دیگر افراد کو ایک تیکھا جواب دیتا ہے: ''کیا اسے معلوم نہ تھا کہ خدا نے اس سے پہلے کئی قوموں کو ہلاک کر دیا جو اس سے زیادہ طاقتور تھیں، علم میں بڑھ کر تھیں اور سرمایہ بھی ان کے پاس زیادہ تھا''۔[1]

تو کہتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ میرے علم کی بدولت ہے لیکن تو بھول گیا ہے کہ تجھ سے زیادہ علم والے اور زیادہ طاقتور افراد بھی تھے۔ کیا وہ عذاب الٰہی سے بچ سکے ہیں؟

نمائش ثروت کا جنون

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ مغرور دولت مند لوگ طرح طرح کے جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک نمائش ثروت کا جنون ہے۔ انہیں اس عمل سے خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اپنی دولت کا لوگوں پر اظہار کریں۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنی گراں قیمت سواری پر سوار ہو کے نکلیں اور برہنہ پا لوگوں کے درمیان سے گزریں۔ ان کے منہ پر گرد و غبار ڈالتے جائیں اور ان کی تحقیر کرتے جائیں۔ انہیں اس عمل سے تسکین ہوتی ہے۔

لیکن دولت کی یہی نمائش ان کے لئے بلائے جان بن جاتی ہے۔ کیونکہ لوگوں کے دلوں میں ان کے خلاف کینہ پرورش پانے لگتا ہے اور جذبات نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہی شرمناک اور مکروہ عمل ان کی زندگی کو ختم کر دیتا ہے یا ان کی دولت کو برباد کر دیتا ہے۔

ممکن ہے کہ اس جنون آمیز عمل کا نتیجہ کسی قسم کی تحریک ہو۔ مثلاً لالچی افراد میں مزید دولت حاصل کرنے کی ہوس میں اضافہ ہو۔ اور سرکش لوگوں میں فرمانبرداری کے جذبات پیدا ہوں۔ مگر اہل ثروت، نمائش دولت کے عمل کو اس تصور کے بغیر انجام دیتے ہیں۔ درحقیقت ان کا عمل بھی ایک قسم کی ہوس ہوتا ہے۔ اس میں کسی سوجھ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

بہر حال قارون بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہ تھا۔ بلکہ جنون نمائش ثروت کا ایک واضح نمونہ تھا۔ قرآن میں ایک جملے کے ذریعے قارون کی اس کیفیت کو بیان کیا گیا ہے: ''قارون پوری زیب و زینت سے اپنی قوم کے سامنے نکلا''۔[2] اس نے اپنی پوری قوت اور توانائی اس کام پر صرف کر دی تھی کہ وہ اپنی تمام دولت و آرائش کی لوگوں کے سامنے نمائش کرے اور یہ بات محتاج ذکر نہیں کہ اتنی دولت کا مالک شخص جب نمود و حشمت کا ارادہ کرے تو وہ کیا کچھ کر سکتا ہے۔

---

[1] سورہ قصص آیت 78

[2] سورہ قصص آیت 79

کتب تواریخ میں اس واقعے کے متعلق بہت سے افسانے اور داستانیں ذکر ہوئی ہیں۔بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ قارون چار ہزار خادموں کی قطار کے ساتھ بنی اسرائیل کے درمیان سے گزرا،جبکہ چار ہزار خادم گراں قیمت گھوڑوں پر سرخ پوشاکیں پہنے ہوئے سوار تھے۔اس کے ساتھ خوش گل کنیزیں بھی تھیں جو سفید خچروں پر سوار تھیں جن پر سنہری زین کسے ہوئے تھے۔ان کی پوشاکیں سرخ اور سب سونے کے زیورات پہنے ہوئی تھیں۔بعض لوگوں نے اس کے خادموں کی تعداد ستر ہزار لکھی ہے اور اسی طرح کی اور باتیں بھی لکھی ہیں۔

لیکن اگر ہم ان تمام بیانات کو مبالغہ آمیز بھی سمجھ لیں پھر بھی ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ نمائش دولت کے لئے اس کے پاس بہت ساز وسامان تھا۔

کاش ہم بھی قارون جیسے ہوتے

جیسا کہ دنیا کا معمول ہے قارون کی جاہ وحشمت کو دیکھ کر لوگوں کے دو گروہ ہو گئے۔دنیا پرست اکثریت نے جب اس خیرہ کن منظر کو دیکھا تو ان کے دل میں تمنائیں مچلنے لگیں۔انھوں نے ٹھنڈی آہ بھری اور کہنے لگے کہ کاش وہ بھی قارون جیسی دولت کے مالک ہوتے۔خود ایک دن،ایک ساعت یا ایک لمحے ہی کے لئے یہ شکوہ نصیب ہوتا۔آہ اس کی کیسی شیریں،جذاب،نشاط انگیز اور لذت بخش زندگی ہے

چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:''جو لوگ دنیاوی زندگی کے طلب گار تھے۔انھوں نے کہا کہ کاش ہمارے پاس بھی اتنی دولت ہوتی جتنی قارون کے پاس ہے''۔[1]

حقیقت میں اس کے پاس تو دولت کا فراواں حصہ ہے۔آفرین ہے قارون پر اور اس کی بے پناہ دولت پر،واہ اس کا کیا جاہ وجلال ہے،اور کتنے خادم اور نوکر چاکر ہیں،تاریخ میں اس جیسا کوئی شخص نہیں ہے۔یہ عظمت اسے خدا نے عنایت کی ہے۔غرض لوگ اسی طرح کی باتیں کرتے تھے۔

درحقیقت اس واقعے میں امتحان کی ایک بہت بڑی بھٹی جل رہی تھی۔اس بھٹی کے بیچ میں قارون تھا۔تاکہ وہ اپنی سرکشی اور غرور کا امتحان دے۔دوسری طرف بنی اسرائیل کے دنیا پرست لوگ اس بھٹی کے گرداگرد مقیم تھے۔لیکن قارون کے لئے ایک درد ناک عذاب تھا۔ایسا عذاب جو ایسی نمائش کے بعد ہوتا ہے۔یہ عذاب اوج عظمت سے قصر زمین میں لے جاتا ہے۔

لیکن اس دنیا طلب بڑے گروہ کے مقابلے میں ایک اقلیت اہل علم صاحبان فکر،پرہیزگار اور باایمان لوگوں کی بھی وہاں موجود تھی جن کا افق فکر ان مسائل سے برتر اور بالاتر تھا۔یہ وہ لوگ تھے جن کے نزدیک احترام شخصیت کا پیمانہ زر اور زور نہ تھا۔ان کے نزدیک انسان کی قدر کا معیار اس کے مادی وسائل نہ تھے۔یہ وہ لوگ تھے کہ دولت وثروت کی عارضی اور مضحکہ انگیز نمود ونمائش پر تمسخر آمیز طور پر مسکرا دیتے تھے،اور اسے ایک بے مغز اور غیر حقیقی شئی سمجھتے تھے۔

چنانچہ قرآن میں مذکور ہے کہ:وہ لوگ جنہیں علم ومعرفت عطا ہوئی تھی،انھوں نے کہا:''تم پر افسوس ہے یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں،ان کے لئے خدا کی طرف سے ثواب اور جزا بہتر ہے''۔[2] ان الفاظ پر انھوں

---

[1] سورہ قصص آیت 79

[2] سورہ قصص آیت 80

نے یہ اضافہ کیا کہ یہ ثواب الٰہی صرف ان لوگوں کا نصیب ہے جو صابرین ہیں۔

قارون کے سامنے زکوٰۃ کا مسئلہ

قارون نے سرکشی اور خدا کی نافرمانی کر کے اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ لیا تھا۔ مگر تواریخ اور روایات میں اس کے متعلق کچھ اور ہی واقعہ بیان ہوا ہے جو قارون کی انتہائی بے شرمی کی علامت ہے۔ اور وہ ماجرا یہ ہے کہ ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قارون سے کہا کہ خدا نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ تیرے مال میں سے زکوٰۃ لوں جو محتاجوں کا حق ہے۔

جب قارون زکوٰۃ کی ادائیگی کے اصول سے مطلع ہوا اور اس نے حساب لگایا کہ اسے کتنی کثیر رقم دینا پڑے گی تو اس نے انکار کر دیا اور اپنے آپ کو بچانے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ بنی اسرائیل کے دولت مندوں کی ایک جماعت کے سامنے کھڑا ہوا اور کہا: ''اے لوگو موسیٰ چاہتا ہے کہ وہ تمہاری دولت خود ہضم کر لے۔ اس نے تمہیں نماز کا حکم دیا تم نے قبول کیا۔ اس کے دوسرے احکامات بھی تم نے مان لئے۔ کیا تم یہ بات بھی برداشت کر لو گے کہ اپنی دولت اسے دے دو؟''

قارون کی شیطانی فکر

اس وقت قارون کے ذہن میں ایک شیطانی خیال آیا۔ اس نے کہا کہ میں نے ایک بہت اچھی تدبیر سوچی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے خلاف ایک منافی عصمت سازش کرنی چاہئے۔ ہمیں چاہئے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک فاحشہ عورت کو تلاش کر کے موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیج دیں، وہ اس پر شرمناک تہمت لگا دے۔ بنی اسرائیل نے اس تجویز کو پسند کیا۔ انھوں نے ایک بدکار عورت کو تلاش کیا اور اس سے کہا کہ ''تو جو کچھ مانگے گی تجھے دیں گے بشرطیکہ تو یہ گواہی دے کہ موسیٰ علیہ السلام کا تجھ سے نامشروع تعلق تھا۔''

اس عورت نے بھی اس تجویز کو منظور کر لیا۔ ایک طرف تو یہ سازش ہوئی۔ دوسری طرف قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ ''بہتر ہے کہ آپ بنی اسرائیل کو جمع کریں اور انہیں الٰہی احکامات سنائیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ پیش کش منظور کر لی اور بنی اسرائیل کو جمع کیا۔

جب لوگ جمع ہو گئے تو انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ: ''آپ ہمیں خدا کے احکام سنائیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ ''بجز اس کے کسی کی پرستش نہ کرو'' صلہ رحم بجالاؤ، ایسا کرو اور ویسا کرو۔ زنا کار آدمی کے لئے خدا نے حکم دیا ہے کہ اگر وہ زنائے محصنہ کرتا ہے تو اسے سنگسار کیا جائے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ الفاظ کہے تو بنی اسرائیل کے دولت مند سازشی لوگوں نے کہا: ''خواہ وہ مجرم تو خود ہی ہو؟''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا۔ ''ہاں ٹھیک ہے خواہ میں خود ہی ہوں۔''

اس مقام پر ان بے شرموں نے، بے ادبی اور گستاخی کی حد کر دی اور کہا کہ: ''ہم جانتے ہیں کہ تو خود اس فعل کا مرتکب ہوا ہے۔ اور فلاں بدکار عورت سے تیرا تعلق رہا ہے۔''

پھر انھوں نے اس عورت کو بلایا اور اس سے کہا کہ تو شہادت دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس عورت کی طرف رخ کیا اور کہا کہ ''میں تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں کہ تو اصل حال بیان کر۔''

جب اس بدکارہ عورت نے یہ بات سنی تو کانپ گئی، اس کی حالت بدل گئی اور اس نے کہا: ''جب آپ مجھ سے سچ بات پوچھتے ہیں تو میں حقیقت حال بیان کرتی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ میں آپ کو متہم کروں، اس کے

بدلے میں انھوں نے مجھے ایک کثیر رقم دینے کا وعدہ کیا تھا۔مگر میں گواہی دیتی ہوں کہ آپ باعفت ہیں اور اللہ کے رسول ہیں۔''

ایک دوسری روایت میں مذکور ہے کہ اس عورت نے یہ بھی کہا کہ لعنت ہو مجھ پر، میں نے اپنی زندگی میں بہت گناہ کئے ہیں مگر کسی پیغمبر پر تہمت نہ لگائی تھی۔

اس کے بعد اس نے دولت کے دو تھیلے جو ان سازشیوں نے اسے دیئے تھے نکال کر سامنے رکھ دیئے اور مذکورہ باتیں کیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سجدے میں گر گئے اور رونے لگے۔اس موقع پر بدسیرت، سازشی قارون پر عذاب نازل ہوا۔اسی روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ خدا نے قارون کے غرق زمین کرنے کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اختیار دیا تھا۔

عذاب الٰہی

اس مقام پر قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں: ''ہم نے اسے اور اسکے گھر کو زمین میں غرق کر دیا''۔[1]

یہ درست ہے کہ جب منکرین کا طغیان اور سرکشی اور ان کی جانب سے تہی دست مومنین کی تحقیر و تذلیل، اور پیمبر الٰہی کے خلاف سازش اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو اس وقت دست قدرت الٰہی دراز ہوتا ہے۔اور ان متکبر گستاخوں کی زندگیوں کو ختم کر دیتا ہے۔اور انہیں ایسی سزا دیتا ہے کہ ان کی افتاد سب لوگوں کے لئے سبب عبرت بن جاتی ہے۔

قرآن میں کلمہ ''خسف''اس مقام پر زمین میں گڑ جانے اور زمین میں پوشیدہ ہو جانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ انسان کی پوری تاریخ میں ایسے واقعات بارہا پیش آئے ہیں کہ سخت زلزلہ آیا اور زمین شگافتہ ہو گئی اور اس نے شہر یا آبادیوں کو نگل لیا۔ مگر اس مقام پر جس حادثہ ''خسف'' کا ذکر ہے، یہ مختلف نوعیت کا ہے۔اس میں فقط قارون اور اس کے خزانے ہی لقمہ زمین ہوئے۔

کیا عجب واقعات ہیں کہ فرعون تو دریائے نیل کی موجوں میں غرق ہو جاتا ہے اور قارون شکم زمین میں سما جاتا ہے۔اس مقام پر یہ امر ہے کہ پانی جو مایہ حیات ہے، وہ فرعون اور اس کے ہمکاروں کو نابود کرنے پر مامور ہوتا ہے۔اور زمین جو انسان کے لئے جائے راحت ہے وہ قارون اور اس کے ساتھیوں کے لئے گورستان بن جاتی ہے۔

یہ مسلم ہے کہ قارون اپنے گھر میں تنہا نہ تھا۔وہ اور اس کے اہل خاندان، اس کے ہم خیال، اور اس کے ظالم اور ستمگر دوست سب کے سب شکم زمین میں سما گئے۔

''لیکن اس وقت اس کی مدد کے لئے کوئی جماعت نہ تھی جو اسے عذاب الٰہی سے بچا سکتی اور وہ خود بھی اپنی کوئی مدد نہ کر سکتا تھا''۔[2]

نہ تو اس کے دسترخوان کے مفت خور، نہ اس کے دلی دوست، نہ اس کا مال و دولت، ان میں سے کوئی شے بھی اسے عذاب الٰہی سے نہ بچا سکی اور وہ سب کے سب قعر زمین میں سما گئے۔

کیا اچھا ہوا کہ ہم قارون کی جگہ نہ تھے

قرآن میں ان لوگوں کے بدل جانے کا ذکر ہے جو گزشتہ روز قارون کے جاہ و جلال اور کروفر کو دیکھ کر وجد اور رشک کر رہے

---

[1] سورہ قصص آیت 81

[2] سورہ قصص آیت 81

تھے اور یہ آرزو کر رہے تھے کہ کاش ہمیشہ کے لئے یا تھوڑی دیر کے لئے ہی یہ شان ہمیں بھی نصیب ہوتی۔

واقعہ عجیب سبق آموز ہے چنانچہ فرمایا گیا: ''جو لوگ گزشتہ روز یہ آرزو کر رہے تھے کہ کاش ہم اس کی (قارون کی) جگہ ہوتے جب انھوں نے اسے (قارون) اور اس کی دولت کو زمین میں دھنستے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے کہ ہمارے خیالات پر افسوس ہے (حق یہ ہے کہ) خدا اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہتا ہے روزی کو فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے''۔[1] کلید رزق صرف اسی کے ہاتھ میں ہے۔ (انھوں نے کہا) آج یہ بات ہم پر ثابت ہوگئی کہ جس آدمی کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ خدا کی دین ہے۔ اس کی عطا کا انحصار اس امر پر نہیں کہ وہ کسی سے راضی اور خوش ہے۔ اور نہ کسی کی محرومی اس وجہ سے ہے کہ وہ شخص اللہ کی جناب میں بے قدر ہے۔ اللہ افراد اور اقوام کو دولت دے کر ان کا امتحان لیتا ہے اور ان کی سیرت اور فطرت کو آشکار کرتا ہے۔

اس کے بعد وہ (رشک کرنے والے) سوچنے لگے کہ اگر گزشتہ روز خدا ان کی دعا کو قبول کر لیتا اور انہیں بھی قارون جیسا ہی بنا دیتا تو ان کا کیسا عبرت ناک انجام ہوتا۔ لہٰذا انھوں نے خدا کی اس نعمت کا شکر ادا کیا اور کہا کہ: ''اگر خدا ہم پر احسان نہ کرتا تو وہ ہمیں بھی زمین میں غرق کر دیتا اور گویا کہ کافر ہرگز نجات نہیں پائیں گے''۔[2]

اب ہم حقیقت کی نظر سے غرور و غفلت اور کفر و ہوس دنیا کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ نیز ہم یہ سمجھ گئے ہیں کہ یہ نمائشی زندگیاں جن کا منظر نہایت دل فریب ہوتا ہے ان کی حقیقت کتنی خوفناک ہے۔

اس ماجرے کے انجام سے یہ امر بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ آخر کار مغرور کافر اور بے ایمان قارون دنیا سے رخصت ہوا۔ ہر چند کہ اس کا شمار بنی اسرائیل کے دانشمندوں اور توریت کے تلاوت کرنے والوں میں ہوتا تھا، نیز وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رشتہ دار بھی تھا۔

حضرت اشموئیل علیہ السلام

خدائے بزرگ و برتر نے ایک عبرتناک واقعہ کی طرف نشاندہی کی ہے کہ جس میں بنی اسرائیل کے ایک گروہ کی سرگذشت بیان کی گئی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد وقوع پذیر ہوئی۔

''قوم یہود'' فرعون کے زیر اثر رہ کر قوم بنی اسرائیل کمزور و ناتواں ہو چکی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دانشمندانہ رہبری کے نتیجے میں انہیں اس افسوسناک حالت سے نجات ملی اور انہوں نے قدرت و عظمت حاصل کر لی۔

اس پیغمبر کی برکت سے خداوند عالم نے انہیں بہت سی نعمات سے نوازا۔ ان نعمات میں سے ایک صندوق عہد بھی تھا، یہودی اپنے لشکر کے آگے اسے اٹھائے رکھتے تھے۔ اس سے ان میں ایک طرح کا سکون قلب اور روحانی طاقت پیدا ہوتی تھی۔

بنی اسرائیل کو یہ قدرت و عظمت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک مدت تک حاصل رہی لیکن یہی کامیابیاں اور نعمتیں رفتہ رفتہ ان کے غرور و تکبر کا باعث بن گئیں اور وہ قانون شکنی کرنے لگے۔ اس کے نتیجے میں انہیں فلسطینیوں کے ہاتھوں شکست اٹھانا پڑی، وہ اپنی قدرت و عظمت کھو بیٹھے اور صندوق عہد بھی ہاتھ سے گنوا بیٹھے، پھر اس قدر پراگندگی اور اختلاف کا شکار ہوئے کہ چھوٹے سے

---

[1] سورہ قصص آیت 82

[2] سورہ قصص آیت 82

چھوٹے دشمنوں سے بھی دفاع کے قابل نہ رہے۔ یہاں تک کہ دشمنوں نے ان کے بہت سے لوگوں کو ان کی سرزمین سے نکال دیا اور ان کی اولاد کو غلام اور قیدی بنالیا۔

کئی برس تک یہ کیفیت رہی یہاں تک کہ خداوند عالم نے ان کی نجات اور رُشد و ہدایت کے لئے حضرت اشموئیل علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر مبعوث فرمایا۔

بنی اسرائیل بھی دشمنوں کے ظلم و جور سے تنگ آ چکے تھے اور کسی پناہ گاہ کی تلاش میں تھے لہٰذا ان کے گرد جمع ہو گئے اور ان سے خواہش کی کہ وہ ان کے لئے رہبر اور امیر مقرر کر دیں تا کہ وہ اس کی قیادت میں ہم آواز اور ایک جان ہو کر دشمن سے جنگ کریں اور عزت رفتہ بحال ہو سکے۔

اشموئیل علیہ السلام ان کی اندرونی کیفیات اور سست ہمتی سے پوری طرح واقف تھے۔ انہوں نے کہا:

''مجھے ڈر ہے کہ جب جہاد کا حکم آئے تو تم کہیں امیر و رہبر کے حکم سے روگردانی نہ کرو اور دشمن سے مقابلے اور جنگ سے پہلو تہی نہ کرو''۔

وہ کہنے لگے: ''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم امیر کے حکم سے منہ پھیر لیں اور اپنی ذمہ داری نبھانے سے دریغ کریں حالانکہ دشمن ہمیں ہمارے وطن سے نکال چکا ہے، ہماری زمینوں پر قبضہ کر چکا ہے اور ہماری اولاد کو قیدی بنا چکا ہے''۔

حضرت اشموئیل علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ اپنی بیماری کی تشخیص کر چکے ہیں اور اب انہیں ایک طبیب کی ضرورت ہے۔ گویا وہ اپنی پسماندگی کے راز سے واقف ہو چکے ہیں۔ اس پر حضرت اشموئیل علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی کا رخ کیا اور قوم کی خواہش کو اس کے حضور پیش کیا، وحی ہوئی: ''میں نے طالوت کو ان کی سربراہی کے لئے منتخب کیا ہے۔''

حضرت اشموئیل علیہ السلام نے عرض کیا: خداوندا میں نے ابھی تک طالوت کو دیکھا ہے نہ اسے پہچانتا ہوں۔

ارشاد ہوا: ''ہم اسے تمہاری طرف بھیجیں گے۔ جب وہ تمہارے پاس آئے تو فوج کی کمان اس کے حوالے کر دینا اور علم جہاد اس کے ہاتھ میں دے دینا''۔

طالوت کون تھے؟

طالوت ایک بلند قامت اور خوبصورت مرد تھے۔ وہ مضبوط اور قوی اعصاب کے مالک تھے۔ روحانی طور پر بھی بہت زیرک، دانشمند اور صاحب تدبیر تھے۔ بعض لوگوں نے ان کے نام ''طالوت'' کو بھی ان کے طولانی قد کا سبب قرار دیا ہے۔

ان تمام صفات کے باوجود وہ مشہور نہیں تھے۔ اپنے والد کے ساتھ دریا کے کنارے ایک بستی میں رہتے تھے۔ والد کے چوپایوں کو چراتے اور زراعت کرتے تھے۔ ایک دن کچھ جانور بیابان میں گم ہو گئے۔ طالوت اپنے ایک دوست کے ساتھ ان کی تلاش میں کئی دن تک سرگرداں رہے۔ انہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ شہر ''صوف'' کے قریب پہنچ گئے۔

ان کے دوست نے کہا: ''ہم تو اشموئیل علیہ السلام کے شہر صوف میں آ پہنچے ہیں۔ آیئے ان کے پاس چلتے ہیں۔ شاید وحی کے سائے میں اور ان کی رائے کی روشنی میں ہمیں کچھ پتہ چل سکے''۔

شہر میں داخل ہوئے تو حضرت اشموئیل علیہ السلام سے ملاقات ہو گئی۔ جب اشموئیل علیہ السلام اور طالوت نے ایک دوسرے کو دیکھا تو گویا دل مل گئے۔ اشموئیل علیہ السلام نے اسی لمحے طالوت کو پہچان لیا۔ وہ جان گئے کہ یہ وہی نوجوان ہے جسے خدا نے ان لوگوں کی قیادت

کے لئے منتخب کیا ہے۔

طالوت نے اپنی کہانی سنائی تو اشموئیل علیہ السلام کہنے لگے: وہ چوپائے تو اس وقت تمہاری بستی کی راہ پر ہیں اور تمہارے باپ کے باغ کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کے بارے میں فکر نہ کرو۔ میں تمہیں اس سے کہیں بڑے کام کے لئے دعوت دیتا ہوں۔ خدا نے تمہیں بنی اسرائیل کی نجات کے لئے مامور کیا ہے۔

طالوت پہلے تو اس پروگرام پر حیران ہوئے اور پھر اسے سعادت سمجھتے ہوئے قبول کر لیا۔ اشموئیل علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: خدا نے طالوت کو تمہاری قیادت سونپی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ تم سب اس کی پیروی کرو۔ اب اپنے تئیں دشمن سے مقابلے کے لئے تیار ی کر لو۔

بنی اسرائیل کے نزدیک تو حسب ونسب اور ثروت کے حوالے سے کئی خصوصیات فرمانروا کے لئے ضروری تھیں اور ان میں سے کوئی چیز بھی طالوت میں دکھائی نہ دیتی تھی اس انتخاب وتقرر پر وہ بہت حیران و پریشان ہو گئے۔

انہوں نے دیکھا کہ ان کے عقیدے کے برخلاف وہ نہ تو ''لاوی'' کی اولاد میں سے تھے جن میں سے نبی ہوتے تھے۔ نہ یوسفؑ اور یہودا کے خاندان سے تھے جو گذشتہ زمانے میں حکمرانی کرتے تھے بلکہ ان کا تعلق تو بنیامین کے گمنام خاندان سے تھا اور پھر وہ مالی طور پر بھی تہی دست تھے۔

انہوں نے اعتراض کیا: ''وہ کیسے حکومت کر سکتا ہے جب کہ ہم اس سے زیادہ حقدار ہیں''۔

اشموئیل علیہ السلام کہتے تھے کہ یہ بہت اشتباہ کر رہے ہیں، کہنے لگے: ''انہیں خدا نے تم پر امیر مقرر کیا ہے، نیز قیادت کے لئے ان کی اہلیت اور لیاقت کی دلیل یہ ہے کہ وہ جسمانی طور پر زیادہ طاقتور ہیں اور روحانی طاقت میں بھی سب سے بڑھ کر ہیں۔ اس لحاظ سے وہ تم سب پر برتری رکھتے ہیں۔

بنی اسرائیل نے خدا کی طرف سے اس کے تقرر کے لئے کسی نشانی یا علامت کا مطالبہ کر دیا۔ اس پر اشموئیل علیہ السلام بولے: انبیاء بنی اسرائیل کی یادگار؛ تابوت (صندوق عہد) جو جنگ میں تمہارے لئے اطمینان اور ولولے کا باعث تھا تمہارے پاس لوٹ آئے گا اور اسے تمہارے آگے آگے چند فرشتوں نے اٹھا رکھا ہوگا''۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ صندوق عہد ان کے سامنے آ گیا۔ یہ نشانی دیکھ کر انہوں نے طالوت کی سربراہی قبول کر لی۔

طالوت نے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی

طالوت نے لشکر کی قیادت کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے تھوڑی ہی مدت میں امور سلطنت کی انجام دہی اور فوج کی تنظیم نو کے سلسلے میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا۔ پھر آپ نے فوج کو دشمن سے مقابلے کی دعوت دی۔ دشمن نے ان کی ہر چیز کو خطرے سے دوچار کر رکھا تھا۔

طالوت نے تاکید کرتے ہوئے کہا: ''میرے ساتھ وہ لوگ چلیں جن کی ساری توجہ جہاد پر مرکوز رہ سکے۔ جن کی صحت ناقص ہو اور جو درمیان ہی میں ہمت ہار بیٹھنے والے ہوں، اس جنگ میں شرکت نہ کریں''۔

بہت جلد ظاہراً ایک کثیر تعداد اور طاقتور فوج جمع ہو گئی اور وہ دشمن کی طرف چل پڑے۔

سورج کی تپش تھی۔ گرمی میں چلتے چلتے انہیں سخت پیاس لگ گئی۔ طالوت خدا کے حکم سے انہیں آزمانا چاہتے تھے اور ان کی

تطہیر بھی کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا: ''جلد تمہارے راستے میں ایک نہر آئے گی۔ اس کے ذریعے خدا تمہارا امتحان لے گا۔ جو لوگ اس میں سے سیر ہو کر پانی پئیں گے ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں البتہ جو تھوڑا سا پانی پئیں گے وہ میرے ساتھی ہیں''۔

ان کی نظر نہر پر پڑی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ جلدی سے وہاں پہنچے۔ خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ تھوڑے سے فوجی اپنے عہد و پیمان پر قائم رہے۔

طالوت نے اپنی فوج کو چھانٹا

طالوت نے دیکھا کہ ان کی فوج کی اکثریت بے ارادہ اور کمزور عہد و پیمان کی حامل ہے اور اس میں تھوڑے سے صاحب ایمان افراد موجود ہیں۔ انہوں نے بے قاعدہ اور نافرمان اکثریت کو چھوڑ دیا اور انہی کم تعداد صاحب ایمان کو ساتھ لیا اور شہر سے گزر کر میدان جہاد کی طرف پیش قدمی جاری رکھی۔

طالوت کی فوج نے اپنی کم تعداد دیکھی تو پریشان اور وحشت زدہ ہوئی۔ فوجیوں نے ان سے کہا: ''ہم میں تو اس طاقتور فوج کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں ہے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن کا دل خدا کی محبت سے معمور تھا وہ دشمن کی فوجی کثرت و قوت اور اپنی تھوڑی تعداد پر ہراساں نہ ہوئے اور کمال شجاعت سے طالوت سے کہنے لگے: آپ جو مصلحت سمجھتے ہیں حکم دیجئے۔ ہم ہر مقام پر آپ کا ساتھ دیں گے اور انشاء اللہ کم تعداد کے باوجود دشمن سے جہاد کریں گے کیونکہ یہ تو کئی مرتبہ ہو چکا ہے کہ کم تعداد خدا کے ارادہ و مشیت کے سہارے کثیر تعداد پر غالب آئی ہے اور خدا استقامت و پامردی دکھانے والوں کے ساتھ ہے''۔

داؤد نے جالوت کو مار ڈالا

طالوت ان کم تعداد اہل ایمان مجاہدین کے ساتھ آمادہ کارزار ہوئے۔ ان لوگوں نے درگاہ الٰہی سے شکیبائی اور کامیابی کی دعا کی۔

جنگ کی آگ بھڑک اٹھی۔ جالوت اپنا لشکر لے کر باہر نکلا۔ لشکروں کے مابین مبارز طلبی ہوئی۔ اس کی بارعب پکار نے دلوں کو لرزا دیا۔ میدان میں جانے کی جرأت کسی میں نہ رہی۔ داؤد ایک کم سن نوجوان تھا۔ شاید وہ جنگ کے لئے بھی میدان میں نہ آیا تھا بلکہ اپنے جنگجو بڑے بھائیوں اور باپ کی خدمت کے لئے چلا آیا تھا لیکن چاک و چوبند اور قوی تھا۔ ''خلدخن'' اس کے ہاتھ میں تھی اس کے ذریعے اس نے پتھر ایسے ماہرانہ انداز میں پھینکے کہ ٹھیک جالوت کی پیشانی اور سر میں پیوست ہو گئے۔ اس کے سپاہیوں پر وحشت اور تعجب کا عالم طاری تھا۔ وہ ان کے درمیان گرا اور مر گیا۔ جالوت کی موت سے اس کی فوج میں عجیب خوف و ہراس پیدا ہو گیا۔ جالوت کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا اور بنی اسرائیل کامیاب ہو گئے۔

تابوت کیا ہے؟

''تابوت'' کا لغوی معنی ہے وہ صندوق جسے لکڑی سے بنایا جائے۔ جنازے کے صندوق کو بھی اسی لئے تابوت کہتے ہیں۔ لیکن تابوت مردوں سے مخصوص نہیں بلکہ ہر قسم کے لکڑی کے صندوق کے لئے مستعمل ہے۔

بنی اسرائیل کا تابوت یا صندوق عہد کیا تھا، وہ کس کے ہاتھ سے بنا تھا اور اس میں کیا چیزیں موجود تھیں۔ اس سلسلے میں ہماری روایات و تفاسیر میں اور اسی طرح ''عہد قدیم'' (توریت) میں بہت کچھ کہا گیا ہے، سب سے زیادہ واضح چیز جو احادیث اہل بیت علیہم السلام اور بعض مفسرین مثلاً ابن عباس سے منقول ہے یہ کہ

''یہ ''تابوت'' وہی صندوق تھا جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے انہیں لپیٹ کر دریا میں پھینکا تھا۔ فرعون کے کارندوں نے اسے دریا میں سے پکڑ لیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس میں سے نکال لیا گیا اور صندوق جوں کا توں فرعون کے پاس محفوظ کر لیا گیا۔ بعد ازاں وہ بنی اسرائیل کے ہاتھ آیا تو وہ اس عجیب صندوق کو محترم شمار کرنے لگے اور اسے متبرک سمجھنے لگے''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ الواح مقدسہ جن پر احکام خدا لکھے ہوئے تھے اس میں رکھ دیں۔ نیز اپنی زرہ اور دوسری یادگار چیزوں کا بھی اس میں اضافہ کر دیا۔ صندوق آپؑ نے اپنے وصی حضرت ''یوشع بن نون علیہ السلام'' کے سپرد کر دیا۔ یوں صندوق کی اہمیت بنی اسرائیل کی نگاہ میں اور بڑھ گئی۔ لہٰذا وہ دشمنوں کے ساتھ جنگوں میں اسے ہمراہ لے جاتے اور اس کا ان پر نفسیاتی اور روحانی طور پر بہت اثر ہوتا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جب تک وہ دل انگیز صندوق ان مقدس چیزوں کے سمیت ان کے ساتھ رہا وہ سربلند رہے اور آبرومندانہ زندگی بسر کرتے رہے لیکن رفتہ رفتہ ان کی دینی بنیادیں کمزور پڑ گئیں اور دشمن ان پر غلبہ حاصل کرتے رہے۔ وہ صندوق بھی ان سے چھن گیا۔

جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ''صندوق عہد تمہاری طرف آئے گا۔ (وہی صندوق کہ) جس میں آل موسیٰ اور آل ہارون کی یادگاریں ہیں جب کہ فرشتوں نے اسے اٹھا رکھا ہوگا''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''صندوق عہد وہ ایسے تبرکات تھے جو حوادث کے موقع پر بنی اسرائیل کے لئے اطمینان بخش تھے اور معنوی و نفسیاتی اثرات کے حامل تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعد ازاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے خاندان کی کچھ یادگاریں بھی اس میں رکھ دی گئی تھیں''۔ [1]

حضرت اشموئیل علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو یہ بات دل نشین کرائی کہ صندوق عہد دوبارہ انہیں مل جائے گا اور جو سکون اور اطمینان وہ کھو بیٹھے ہیں دوبارہ حاصل کر لیں گے۔ معنوی و تاریخی پہلو کے حامل اس صندوق کی اہمیت دراصل بنی اسرائیل کے لئے ایک پرچم اور شعار سے بڑھ کر تھی۔ اسے دیکھ کے ان کی نظروں میں اپنی عظمت رفتہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

حضرت اشموئیل علیہ السلام نے خبر دی کہ وہ صندوق لوٹ آئے گا فطری امر ہے کہ یہ بنی اسرائیل کے لئے ایک بہت بڑی بشارت تھی۔

فرشتے صندوق عہد کیسے لائے؟

جیسا کہ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ ''فرشتے اس صندوق کو اٹھائے ہوئے ہیں'' یہاں پر سوال یہ ہوتا ہے کہ فرشتے صندوق عہد کو کیسے لائے؟ اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں۔ ان میں سے زیادہ واضح تواریخ کے حوالے سے یہ ہے کہ جب صندوق عہد فلسطین کے بت پرستوں کے ہاتھ لگا اور وہ اسے اپنے بت خانے میں لے گئے اس کے بعد وہ بہت سی مصیبتوں اور ابتلاؤں کا شکار ہو گئے تو ان میں سے بعض کہنے لگے کہ یہ سب کچھ صندوق عہد کے آثار میں سے ہے، لہٰذا انہوں نے طے کر لیا کہ اسے اپنے شہر اور علاقے سے باہر بھیج دیں گے۔ کوئی شخص اسے باہر لے جانے کو تیار نہ ہوا۔ مجبوراً دو بیل جوتے گئے اور صندوق عہد کو باندھ کر بیلوں کو بیابان میں جا کر چھوڑا گیا۔ اتفاق سے یہ واقعہ ٹھیک اس وقت رونما ہوا جب طالوت کو بنی اسرائیل کا فرمانروا بنایا گیا۔

خدا نے فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان دو بیلوں کو اشموئیل کے شہر کی طرف ہانک کر لے جائیں۔ بنی اسرائیل نے صندوق عہد کو دیکھا تو اسے طالوت کے خدا کی طرف سے مامور ہونے کی نشانی کے طور پر قبول کر لیا۔ اس لئے ظاہراً تو دو بیل اسے شہر میں لائے

---

[1] سورہ بقرہ آیت 248

لیکن درحقیقت یہ کام خدائی فرشتوں کی وجہ سے انجام پذیر ہوا اسی وجہ سے صندوق اٹھالانے کی نسبت فرشتوں کی طرف دی گئی ہے۔اصولی طور پر فرشتہ اور ملک قرآن حکیم اور روایات میں ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے۔اس مفہوم میں روحانی عقل رکھنے والے موجودات کے علاوہ اس جہان کی مخفی قوتوں کا ایک سلسلہ بھی شامل ہے۔

یہ داؤد کون سے داؤد تھے

اگر چہ قرآن میں صراحت موجود نہیں کہ یہ داؤد وہی پیغمبر ہیں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے والد گرامی ہیں یا کوئی اور شخص۔لیکن اس قرآن سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مقام نبوت کے حامل ہوئے قرآن آگے چل کر یوں بیان کرتا ہے:

''خدا نے اسے حکومت اور علم عطا کیا اور جو کچھ وہ چاہتا تھا اسے سکھایا''۔

ایسی تعبیر عام طور سے انبیاء کے متعلق ہی ہوتی ہے۔

''اور ہم نے اسکی حکومت کو مضبوط کر دیا اور اسے علم و دانش عطا کیا''۔

اس سلسلہ کی ذیل میں جو احادیث منقول ہیں ان سے بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ وہی مشہور پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام تھے۔

حضرت داؤد علیہ السلام

داؤد علیہ السلام کی زندگی سے درس حاصل کریں

حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے بزرگ انبیاء میں سے تھے انہیں اللہ نے ایک عظیم حکومت عطا کی۔قرآن مجید کی متعدد آیات میں ان کے بلند مقام کی تعریف کی گئی ہے۔

ان کی جسمانی طاقت کا یہ عالم تھا کہ جب بنی اسرائیل کا ایک ظالم حکمران جالوت میدان جنگ میں آپؑ کے مدمقابل آیا تو آپؑ نے آلہ سنگ اندازی سے اس قوت سے پتھر پھینکا کہ جالوت گھوڑے کی پشت سے زمین پر آ گیا اور اپنے خون میں لوٹنے لگا۔

بعض نے لکھا ہے کہ پتھر نے اس کا سینہ چیر دیا اور دوسری طرف سے نکل گیا۔

دوسری طرف آپؑ کی سیاسی اقتدار کا یہ حال تھا کہ ایک طاقتور حکومت آپؑ کے ہاتھ میں تھی اور آپؑ پوری طاقت سے دشمنوں کے مقابلے میں کھڑے ہوتے تھے۔

علماء نے یہاں تک کہا ہے کہ آپؑ کی محراب عبادت کے چاروں طرف ہزار افراد شام سے صبح تک تیار کھڑے رہتے تھے۔

نیز آپؑ کی روحانی، اخلاقی اور عبادی طاقت کا یہ عالم تھا کہ رات کا ایک حصہ بیدار رہتے اور پرودگار کی عبادت میں مشغول رہتے اور سال بھر کے آدھے ایام روزے میں گزارتے۔

نعمتوں کے لحاظ سے بھی اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو طرح طرح کی ظاہری اور باطنی نعمتیں عطا کر رکھی تھیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت داؤد علیہ السلام ایک ایسی شخصیت تھے کہ جنگ میں، عبادت میں، علم میں اور حکومت میں بہت قوی تھے اور انہیں فراواں نعمتیں حاصل تھیں۔

جناب داؤد علیہ السلام پر الٰہی نعمتیں

قرآن مجید اجمال کے بعد تفصیل کی اپنی خاص روش کے مطابق اب حضرت داؤد علیہ السلام پر نعمات الٰہی کی کچھ تفصیل بیان کرتا

ہے۔ارشاد ہوتا ہے:''ہم نے اس کے لئے پہاڑ مسخر کر دیئے،اس طرح سے کہ صبح وشام وہ اس کے ساتھ تسبیح خدا کرتے تھے''۔[1]

''نہ صرف پہاڑ بلکہ سب پرندے بھی اس کے لئے مسخر کر دیئے تا کہ ہمیشہ اس کے ہمراہ اللہ کی تسبیح کریں''۔[2]

''یہ سب پرندے اور پہاڑ حکم داؤد کے مطیع تھے،اس کے ساتھ ہم آواز تھے اور اس کی طرف بازگشت کرنے والے تھے''۔[3]

اگر چہ عالم کے تمام ذرات خدا کا ذکر،تسبیح اور حمد کرتے ہیں۔خواہ کوئی داؤد علیہ السلام ان کے ساتھ ہم صدا ہو یا نہ ہو،لیکن داؤد علیہ السلام کا امتیاز یہ تھا کہ ان کے صدا بلند کرنے اور تسبیح کی نغمہ سرائی کے وقت ان موجودات کے اندر جو کچھ پوشیدہ تھا وہ آشکار وظاہر ہو جاتا تھا اور اندرونی زمزمہ بیرونی نغمہ کے ساتھ تبدیل ہو جاتا تھا،جیسا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر''سنگریزہ'' کی تسبیح کے بارے میں بھی روایات آئی ہیں۔

ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ:''داؤد علیہ السلام،دشت و بیابان کی طرف نکلے اور جس وقت آپؑ زبور کی تلاوت کرتے تو کوئی پہاڑ اور پتھر اور پرندہ ایسا نہ تھا کہ جو ان کے ساتھ ہم آواز نہ ہوتا ہو''۔

قرآن اس معنوی فضیلت کا ذکر کرنے کے بعد ایک مادی فضیلت کا بیان شروع کرتے ہوئے کہتا ہے:''اور ہم نے اس کے لئے لوہے کو نرم کر دیا''

ہوسکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ خدا نے داؤد علیہ السلام کو معجزانہ طور پر لوہے کو نرم کرنے کا طریقہ سکھایا تھا:''اس طرح سے کہ وہ اس سے زرہ بنانے کے لئے مضبوط ومحکم اور پتلی پتلی نازک قسم کی کڑیاں بنا سکیں''۔[4]

2۔بعض کہتے ہیں کہ یہ تسبیح ظاہری آواز کے ساتھ ساتھ ایک طرح کے ادراک وشعور کے ہمراہ تھی کہ جو ذرات عالم کے باطن میں ہے۔اس نظریہ کے مطابق تمام موجودات عالم ایک قسم کی عقل اور شعور کے حامل ہیں اور جب یہ موجودات اس عظیم پیغمبر علیہ السلام کی مناجات کے وقت دل انگیز آواز سنتے تھے تو ان کے ساتھ ہم آواز ہو جاتے اور یوں سب باہم ملکر تسبیح کرتے۔

3۔بعض نے اس احتمال کا ذکر بھی کیا ہے کہ یہ تسبیح تکوینی ہے کہ جو تمام موجودات زبان حال سے کرتے ہیں اور ان کا نظام خلقت اس امر کی بخوبی حکایت کرتا ہے کہ اللہ ہر عیب سے پاک ومنزہ ہے اور علم وقدرت اور ہر قسم کی صفات کمال کا حامل ہے۔

لیکن یہ بات حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ مخصوص نہیں کہ اسے ان کی خصوصیات میں سے شمار کیا جائے۔اس لحاظ سے مناسب تر دوسری تفسیر ہے اور یہ امر قدرت الٰہی سے بعید نہیں ہے۔یہ ایک زمزمہ تھا کہ جو ان موجودات عالم کے اندر اور ان کے باطن

---

[1] سورہ ص،آیت 18

[2] سورہ ص،آیت 19

[3] سورہ ص،آیت 19

مفسرین کی اس سلسلے میں مختلف آراء ہیں کہ پہاڑ اور پرندے حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ کس طرح ہم آواز تھے اور اس کی کیفیت کیا تھی؟ان آراء کا خلاصہ یہ ہے:

1۔بعض کہتے ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی دلکش،جاذب اور دل گداز آواز تھی کہ جو پہاڑوں پر اثر انداز ہوتی تھی اور پرندوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی (لیکن یہ کوئی ایسی اہم فضیلت نہیں کہ قرآن اسے اس اہمیت کے ساتھ ذکر کرے۔)

2۔بعض کہتے ہیں کہ یہ تسبیح ظاہری آواز کے ساتھ ساتھ ایک طرح کے ادراک وشعور کے ہمراہ تھی کہ جو ذرات عالم کے باطن میں ہے۔اس نظریہ کے مطابق تمام موجودات عالم ایک قسم کی عقل اور شعور کے حامل ہیں اور جب یہ موجودات اس عظیم پیغمبر علیہ السلام کی مناجات کے وقت دل انگیز آواز سنتے تھے تو ان کے ساتھ ہم آواز ہو جاتے اور یوں سب باہم مل کر تسبیح کرتے۔

[4] سورہ سبا ء آیت 11

میں ہمیشہ سے جاری تھا لیکن خدا نے قوت اعجاز سے اسے حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے ظاہر کیا جیسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہتھیلی پر سنگریزوں کا تسبیح کرنا مشہور ہے۔

یا یہ کہا جائے کہ داؤد علیہ السلام سے پہلے بھی جنگوں میں دفاع کے لئے لوہے کی سلیٹوں سے استفادہ ہوتا تھا، کہ جو بھاری بھی ہوتی تھیں، اور اگر انہیں پہنا جاتا تو وہ اتنی خشک اور بے لچک بھی ہوتی تھیں کہ جو جنگجو غازیوں کے لئے انتہائی پریشان کن ہوتی تھیں، کوئی بھی شخص اس زمانہ تک لوہے کی باریک اور مضبوط کڑیوں سے زرہ کی مانند کوئی ایسی چیز نہ بنا سکا تھا کہ جو لباس کی مانند آسانی کے ساتھ بدن پر آسکے اور بدن کی حرکات کے ساتھ نرم اور رواں رہے۔

قرآن کا ظاہر یہ ہے کہ لوہے کا داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں نرم ہونا، خدا کے حکم سے اور معجزانہ صورت میں انجام پذیر ہوتا تھا۔ اس بات میں کیا چیز مانع ہے کہ وہی ذات کہ جو بھٹی کو لوہا نرم کرنے کی خاصیت بخشتی ہے، اسی خاصیت کو ایک دوسری شکل میں داؤد علیہ السلام کے پنجوں میں قرار دے دے، بعض اسلامی روایات میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ خدا نے داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ:

''تم ایک اچھے آدمی ہو، مگر تم بیت المال سے اپنی روزی حاصل کرتے ہو، داؤد علیہ السلام چالیس دن تک روتے رہے، (اور خدا سے اس کے حل کی درخواست کی) تو خدا نے لوہے کو ان کے لئے نرم کر دیا اور ہر روز ایک زرہ بنا لیتے تھے اور اس طرح سے وہ بیت المال سے بے نیاز ہو گئے۔''[1]

بہر حال داؤد علیہ السلام اس توانائی کے ذریعہ، کہ جو خدا نے انہیں دی تھی، بہترین طریق یعنی جہاد کا وسیلہ بنانے سے، ایسا وسیلہ جو دشمن سے حفاظت کرے۔ استفادہ کرتے تھے، اور اس سے زندگی کے عام وسائل میں ہرگز فائدہ نہ اٹھایا، اور عجب یہ کہ اس کی آمدنی سے بعض روایات کے مطابق۔ اپنی سادہ زندگی کی ضروریات پورا کرنے کے علاوہ کچھ نہ کچھ حاجت مندوں پر بھی خرچ کیا کرتے تھے، ان تمام باتوں کے علاوہ اس کا ایک فائدہ یہ تھا کہ وہ ان کا ایک بولتا ہوا معجزہ شمار ہوتا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش [2]

قرآن میں پہلے حضرت داؤد علیہ السلام کی خاص صفات بیان کی گئی تھیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں کا ذکر تھا۔ اس کے بعد اب دادرسی اور قضاوت کے سلسلے میں حضرت داؤد علیہ السلام کو پیش آنے والے ایک واقعے کا تذکرہ۔

پہلے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ''کیا داؤد کی دیوار محراب سے اوپر جانے والے شکایت کنندگان کا واقعہ تجھ تک پہنچا ہے''۔[3]

---

[1] یہ ٹھیک ہے کہ بیت المال ایسے لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے ہوتا ہے کہ جو معاشرے کی بغیر عوض کے خدمت کرتے ہیں، اور ایسے اہم بوجھ اٹھاتے ہیں کہ جو پسماندہ ہوں، لیکن یہ بات زیادہ بہتر ہے کہ انسان کسی خدمت کو بھی انجام دے اور اپنے ہاتھ کی کمائی سے (توانائی کی صورت میں) گذر اوقات کرے اور داؤد علیہ السلام یہ چاہتے تھے کہ وہ اسی قسم کے ممتاز بندے بنیں۔

[2] قرآن میں حضرت داؤد علیہ السلام کے فیصلہ کرنے کے بارے میں سادہ اور واضح گفتگو کی گئی ہے، اس ضمن میں جو تحریفات اور غلط تعبیرات کی گئی ہیں ان کے باعث لاشعوری طور پر مفسرین کے درمیان ایک بڑا نزاع پیدا ہوا ہے اس پر اس قدر شور وغوغا ہوا ہے کہ بعض مسلمان مفسرین بھی اس کی زد میں آگئے ہیں اور انھوں نے اس عظیم نبی کے بارے میں غلط اور کہیں کہیں بہت ہی ناروا فیصلے کئے ہیں۔ ہم سب پہلے بغیر کسی تشریح کے آیات قرآنی کا متن پیش کرتے ہیں۔ تاکہ قارئین خالی ذہن کے ساتھ آیات کا مفہوم سمجھ سکیں۔

[3] سورہ ص، آیت 21

بہر حال حضرت داؤد علیہ السلام کے ارد گرد اگر چہ بہت سے محافظین موجود تھے تاہم دو آدمی ایک جھگڑے کے سلسلے میں عام راستے سے ہٹ کر محراب اور دیوار قصر سے اوپر آئے اور اچانک آپؑ کے سامنے آدھمکے۔

جیسا کہ قرآن حکیم اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے:

''وہ اچانک داؤد علیہ السلام کے سامنے آنکلے (بغیر کسی اطلاع کے اور بغیر کسی اجازت کے) لہٰذا ان پر نظر پڑی تو داؤد علیہ السلام وحشت زدہ ہوئے اور گھبرائے۔''[1]

کیونکر انہیں خیال ہوا کہ ہوسکتا ہے ان لوگوں کا ان کے بارے میں غلط ارادہ ہو

لیکن انھوں نے بہت جلد آپؑ کی پریشانی دور کرتے ہوئے کہا: ''ڈریں نہیں، ہم دونوں ایک شکایت لے کر آپؑ کے پاس آئے ہیں۔ ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے اور ہم آپ کے پاس دادرسی کے لئے آئے ہیں''

''اب آپؑ ہمارے بارے میں حق کے ساتھ فیصلہ کریں اور ظلم روا نہ رکھیں اور راہ راست کی طرف ہماری ہدایت کریں''۔[2]

واضح رہے کہ اس مقام پر حضرت داؤد علیہ السلام کو زیادہ موقع نہ دیا۔ ایک نے شکایت کرنے میں پہل کی، کہنے لگا: ''یہ میرا بھائی ہے، اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس ایک سے زیادہ نہیں، لیکن یہ اصرار کرتا ہے کہ یہ ایک بھی مجھے دے دے، گفتگو میں یہ مجھ پر بھاری ہے اور مجھ سے زیادہ باتونی ہے''۔[3]

حضرت داؤد علیہ السلام نے دوسرے فریق کی بات سنے بغیر شکایت کرنے والے سے کہا: ''اپنی بھیڑوں میں تیری بھیڑ کا اضافہ کرنے کے لئے اس نے تقاضا کر کے ظلم روا رکھا ہے''۔[4]

بہر حال یوں لگتا ہے کہ طرفین یہ بات سن کر مطمئن ہو گئے اور حضرت داؤد علیہ السلام کے یہاں سے چلے گئے۔ لیکن داؤد علیہ السلام سوچ میں پڑ گئے۔ انھوں نے فیصلہ تو عدل کی بنیاد پر کیا تھا کیونکہ اگر فریق ثانی کو مدعی کا دعویٰ قبول نہ ہوتا تو یقیناً وہ اعتراض کرتا ہے۔ اس کا سکوت اس امر کے لئے بہترین دلیل تھا کہ معاملہ وہی ہے جو شکایت کرنے والے نے پیش کیا ہے لیکن ان سب امور کے باوجود عدالتی اقدار کا تقاضا تھا کہ داؤد علیہ السلام اپنی بات میں جلدی نہ کرتے بلکہ فریق ثانی سے بھی شخصاً سوال کرتے اور پھر فیصلہ سناتے۔ لہٰذا اس کام پر وہ خود پشیمان ہوئے، اور داؤد علیہ السلام نے گمان کیا کہ اس واقعے کے ذریعے، ہم نے اس کا امتحان لیا ہے۔

''اس نے استغفار کی، اپنے رب سے طلب بخشش کی، سجدے میں گر گیا اور توبہ کی''۔[5]

بہر حال اللہ نے ان پر اپنا لطف و کرم کیا اور اس ترک اولیٰ میں ان کی لغزش کو معاف کر دیا۔ جیسا کہ بعد کی ابحاث میں قرآن کہتا ہے:

''ہم نے اس کے عمل کو بخش دیا، اور وہ ہمارے نزدیک عالی مقام اور نیک مستقبل کا حامل ہے''۔[6]

---

[1] سورہ ص آیت 22

[2] سورہ ص آیت 22

[3] سورہ ص آیت 23

[4] سورہ ص آیت 24

[5] سورہ ص آیت 24

[6] سورہ ص آیت 25

داؤد علیہ السلام کو پیش آمدہ واقعے کی حقیقت

قرآن مجید سے جو کچھ معلوم ہوتا وہ اس سے زیادہ نہیں کہ کچھ افراد دادخواہی کے لئے حضرت داؤد علیہ السلام کی محراب سے اوپر چڑھ کر آپ کی خدمت میں پہنچے۔ پہلے تو آپ گھبرا گئے۔ پھر شکایت کرنے والے کی بات سنی۔ ان میں سے ایک کے پاس ننانوے بھیڑیں تھیں، دوسرے کے پاس صرف ایک بھیڑ تھی، ننانوے بھیڑوں والا اپنے بھائی پر زور دے رہا تھا کہ وہ ایک بھیڑ بھی اسے دے دے۔ آپؑ نے شکایت کرنے والے کو سچا قرار دیا اور دوسرے کے اصرار کو ظلم قرار دیا۔ پھر اپنے کام پر پشیمان ہوئے اور اللہ سے معافی کا تقاضا کیا۔ خدا نے آپؑ کو بخش دیا۔

یہاں دو تعبیر زیادہ غور طلب ہیں۔ ایک آزمائش اور دوسری استغفار اور توبہ۔ اس سلسلے میں قرآن نے کسی واضح امر کی نشاندہی نہیں کی۔ لیکن قرآن میں غور وفکر اور ان آیات کی تفسیر کے سلسلے میں منقول روایات میں موجود قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام قضاوت میں بہت زیادہ علم ومہارت رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ آپؑ کو آزمائے لہٰذا آپؑ کو ایسے غیر معمولی حالات پیش آئے۔ (مثلاً ان آدمیوں کا عام راستے سے ہٹ کر محراب کے اوپر سے آپؑ کے پاس آپہنچا) آپؑ نے جلد بازی کی اور اس سے پہلے کہ فریق ثانی سے وضاحت طلب کرتے آپؑ نے فیصلہ سنا دیا اگرچہ فیصلہ عادلانہ تھا۔

اگرچہ آپؑ بہت جلد اپنی اس لغزش کی طرف متوجہ ہوگئے اور وقت گزرنے سے پہلے اس کی تلافی کی۔ لیکن بہرحال جو کام آپؑ سے سرزد ہوا تھا وہ نبوت کے مقام بلند کے شایان شان نہ تھا۔ اس لئے آپؑ نے ترک اولیٰ پر استغفار کی اور اللہ نے بھی انہیں عفو وبخشش سے نوازا۔

مذکورہ تفسیر کی شاہد وہ قرآنی اشارہ ہے جو زیر بحث قرآنی گفتگو کے فوراً بعد آئی ہے۔ اس میں حضرت داؤد علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ''ہم نے تجھے زمین پر اپنا خلیفہ قرار دیا ہے، لہٰذا لوگوں کے درمیان حق وعدالت کے مطابق فیصلہ کر اور ہوا وہوس کی پیروی نہ کر''۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش فیصلے کے طریقے میں تھی۔ لہٰذا اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس عظیم نبی علیہ السلام کی شان اور مقام کے خلاف ہو۔

موجودہ توریت کی خرافاتی داستان

اب ہم توریت کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ وہ اس سلسلے میں کیا کہتی ہے:

نیز بعض ناآگاہ اور بے خبر افراد نے جو تفسیریں کی ہیں، ان کی اصل خبر بھی تلاش کرتے ہیں۔

توریت کی دوسری کتاب اشموئیل کی فصل 11 میں جملہ 2 تا 27 میں یوں بیان کیا گیا ہے:

اس داستان کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ ایک روز داؤد علیہ السلام اپنے محل کی چھت پر جاتے ہیں۔ ساتھ والے گھر میں ان کی نظر پڑتی ہے تو انہیں ایک عورت غسل کرتے ہوئے برہنہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پھر جیسے بن پڑتا ہے اسے اپنے گھر لے آتے ہیں اور وہ داؤد علیہ السلام سے حاملہ ہو جاتی ہے۔ اس عورت کا شوہر لشکر داؤد علیہ السلام کا ایک اہم افسر تھا۔ وہ ایک پاک طینت اور باصفا شخص تھا۔ داؤد علیہ السلام (نعوذ باللہ) ایک بزدلانہ سازش کے ذریعے اسے ایک خطرناک جنگ میں بھجوا کر قتل کروا دیتے ہیں اور پھر اس کی بیوی کو قانونی طور پر اپنے نکاح میں لے آتے ہیں۔

اب آپ داستان کا باقی حصہ موجودہ توریت کی زبانی سنیں۔ اسی کتاب دوم اشموئیل علیہ السلام کی 12 ویں فصل میں ہے۔

خداوند نے ''ناثان'' (جو بنی اسرائیل کے ایک نبی اور جناب داؤد علیہ السلام کے مشاور تھے) کو داؤد علیہ السلام کے پاس بھیجا اور کہا:

ایک شہر میں دو آدمی رہتے تھے۔ ایک امیر تھا دوسرا غریب، امیر آدمی کے پاس بہت سی بھیڑیں اور گائیں تھیں۔ غریب کے پاس بھیڑ کے ایک بچے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک روز ایک مسافر امیر آدمی کے یہاں آیا۔ اس نے اپنی بھیڑوں میں سے مہمان کے لئے غذا تیار کرنے میں پس وپیش کیا۔ غریب کا بھیڑ کا بچہ لے کر اسے ذبح کر دیا۔

اب کیا ہونا تھا، داؤد علیہ السلام انتہائی غصے ہوئے۔ ناثان سے کہنے لگے: ''بخدا جس نے یہ کام کیا وہ قتل کا مستحق ہے، اسے ایک بھیڑ کی جگہ پر چار بھیڑیں دینی چاہئیں''۔

لیکن ناثان نے داؤد علیہ السلام سے کہا: ''وہ شخص تو ہے۔''

داؤد علیہ السلام اپنے غلط کام کی طرف متوجہ ہوئے اور توبہ کی اور اللہ نے ان کی توبہ قبول کی لیکن اس کے باوجود ان پر بھاری مصیبتیں آئیں۔

اس مقام پر توریت میں ایسی عبارت ہے جس کے ذکر سے قلم کو شرم آتی ہے لہٰذا ہم اس سے صرف نظر کرتے ہیں۔ توریت کی داستان کے اس حصے میں بعض نکات خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہیں، مثلاً:

1۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس کوئی شخص قضاوت کے لئے نہیں آیا، بلکہ ان کے ایک مشیر جو نبی تھے انھوں نے نصیحت کے طور پر ان سے ایک داستان بیان کی۔ اس میں دو بھائیوں کا واقعہ اور ان میں سے ایک کا دوسرے سے تقاضا کرنا مذکور نہیں ہے بلکہ ایک امیر اور ایک غریب آدمی کا ذکر ہے جن میں سے ایک کے پاس بہت سی بھیڑیں اور گائیں تھیں جبکہ دوسرے کے پاس بھیڑ کا صرف ایک بچہ تھا لیکن امیر آدمی نے اپنے مہمان کے لئے غریب آدمی کی بھیڑ کا بچہ ذبح کر دیا۔ اس واقعے میں نہ محراب کی دیوار سے اوپر جانے کا ذکر ہے، نہ آپؑ کے وحشت زدہ ہوجانے کی بات ہے، نہ دو بھائیوں کے دعوے کا معاملہ ہے اور نہ ہی توبہ وبخشش کی درخواست کا بیان ہے۔

2۔ داؤد علیہ السلام نے اس ظالم امیر شخص کو قتل کا مستحق سمجھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک بھیڑ کے لئے آخر قتل کیوں؟

3۔ ساتھ ہی انھوں نے اس حکم کے خلاف حکم صادر کیا اور کہا کہ ایک بھیڑ کے بدلے اسے چار بھیڑیں دینی چاہئیں، آخر کس بناء پر؟

4۔ داؤد علیہ السلام نے ''اوریّا'' کی بیوی کے بارے میں خیانت سے متعلق اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔

5۔ خدا نے انہیں معاف کر دیا (اتنی آسانی سے، کس بناء پر؟)۔

6۔ اللہ نے داؤد علیہ السلام کے بارے میں عجیب وغریب سزا کا فیصلہ کیا کہ جسے نقل نہ کرنا بہتر ہے۔

7۔ یہی عورت ایسے ''روشن ماضی'' کے باوجود سلیمان علیہ السلام کی ماں بنی ان داستانوں کا ذکر واقعاً تکلیف دہ ہے لیکن کیا کیا جاسکتا ہے کہ بعض جاہل افراد نے نادانی سے ان اسرائیلی روایات کے زیر اثر قرآن مجید کی پاک وپاکیزہ آیات کا چہرہ سیاہ کر دیا ہے اور ایسی باتیں کہی ہیں کہ حق کو واضح کرنے کے لئے اس رسوا داستان کا کچھ حصہ ذکر کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

اب ہم سوال کرتے ہیں:

1۔ وہ نبی کہ قرآن میں اللہ نے جس کے دس عظیم اوصاف بیان کئے ہیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جس کی سرگزشت سے ہدایت حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے، کیا ممکن ہے کہ ان تہمتوں کے ہزارویں حصے کی بھی اس کی طرف نسبت دی جاسکے؟

2۔قرآن مجید بعد کی آیات میں کہتا ہے:

"یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ"

اے داؤدؑ! ہم نے تجھے زمین میں اپنا خلیفہ اور نمائندہ بنایا۔

کیا یہ آیت مذکورہ خرافات سے ہم آہنگ ہے؟

3۔اگر کوئی عام شخص ہو، خدا کا نبی نہ ہو اور وہ اس قسم کے جرم کا مرتکب ہو، اپنے وفادار پاک طینت باایمان افسر کی بیوی کو ایسے گھٹیا طریقے سے اس کے ہاتھوں سے کھسکا لے تو لوگ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کریں گے اور اس کی سزا کیا ہوگی؟ یہاں تک کہ اگر یہ کام افسق الفاسقین سے سرزد ہو تب بھی جائے تعجب ہے۔

یہ صحیح ہے کہ توریت نے حضرت داؤد علیہ السلام کو پیغمبر قرار نہیں دیا تاہم ان کا ذکر ایک بلند مرتبہ عادل حکمران کے طور پر کیا ہے، کہ جو بنی اسرائیل کے عظیم عبادت خانے کا مؤسّس تھا۔

4۔یہ بات قابل توجہ ہے کہ توریت کی مشہور کتب میں سے ایک "مزامیر داؤد علیہ السلام" ہے جس میں حضرت داؤد علیہ السلام کی مناجات ہیں۔کیا ایسے شخص کی مناجات اور باتیں کتب آسمانی کا حصہ قرار دی جاسکتی ہیں؟

5۔جو شخص تھوڑی سی عقل بھی رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ موجودہ تحریف شدہ توریت کی داستانیں خرافات کا ایسا مجموعہ ہیں جو مکتب انبیاء کے دشمنوں یا بہت ہی بے شعور اور جاہل افراد کی ساختہ و پرداختہ ہیں۔لہٰذا انہیں کس طرح بحث کی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے؟

جی ہاں قرآن کی یہ عظمت ہے کہ وہ ایسی خرافات سے بالکل پاک ہے۔

اسلامی روایات میں توریت کی بیان کردہ قبیح اور بے ہودہ داستان کی نہایت سختی سے تکذیب کی گئی ہے۔ان میں سے ایک روایت امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے۔آپؑ نے فرمایا:

"اگر کسی ایسے شخص کو میرے پاس لایا جائے کہ جو یہ کہے کہ داؤد علیہ السلام نے "اوریّا" کی بیوی سے شادی کی، تو میں اس پر دو حدیں جاری کروں گا ایک حد نبوت کے لئے اور دوسری اسلام کے لئے"۔

کیونکہ اس میں ایک طرف تو ایک مرد مومن کی طرف ایک غیر شرعی امر کی نسبت ہے اور دوسری طرف مقام نبوت کی ہتک حرمت ہے۔لہٰذا ایسی بات کرنے والے پر دو مرتبہ حد قذف جاری ہونی چاہئے اور اسے دو مرتبہ اَسّی (80) کوڑے لگائے جانے چاہئیں۔

جب امام رضا علیہ السلام سے "اوریّا" کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

"حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں جن عورتوں کے شوہر مرجاتے یا قتل ہوجاتے وہ پھر کبھی شادی نہ کرتی تھیں (اور یہ امر بہت سی برائیوں اور قباحتوں کی بنیاد تھا) حضرت داؤد علیہ السلام وہ پہلے شخص تھے جن پر اللہ نے اس کام کو مباح قرار دیا (تاکہ یہ رسم ختم ہوجائے اور بیوہ عورتیں اس مصیبت سے نجات پائیں) لہٰذا جب اوریّا (اتفاق سے ایک جنگ میں) مارا گیا تو داؤد علیہ السلام نے ان کی بیوی سے شادی کرلی، اور یہ امر اس زمانے کے لوگوں پر بہت گراں گزرا (اور بعد ازاں اس پر انھوں نے افسانے گھڑ لئے)"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ "اوریّا" کی ایک سادہ سی حقیقت کی بنیاد پر تھی۔حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک کام الٰہی

ذمہ داری کے طور پر انجام دیا تھا۔لیکن دانا دشمنوں، نادان دوستوں اور افسانہ پرازوں نے کہ جنھیں عجیب وغریب باتیں بنانے اور جھوٹ گھڑنے کی عادت تھی اس واقعے پر خوب حاشیہ آرائی کی اور ایسی ایسی باتیں بنائی کہ انسان کو وحشت ہوتی ہے۔

کسی نے کہا: اس شادی کی کچھ نہ کچھ بنیاد تو ضرور ہے۔

دوسرے نے کہا: ضروری بات ہے کہ ''اوریّا'' کا گھر داؤد علیہ السلام کی ہمسائیگی میں ہوگا۔

آخر کسی نے داؤد علیہ السلام کی نظریں اوریّا کی بیوی پر ڈلوائیں، پرندے کا قصہ گھڑا۔

آخر کار اس عظیم پیغمبر کو طرح طرح کے شرمناک گناہان کبیرہ سے متہم کیا گیا۔ پھر بے وقوف جاہلوں نے ایک زبان سے دوسری زبان تک پہنچایا اور اگر اس افسانے کا ذکر مشہور کتب میں نہ ہوتا تو ہم بھی اسے نقل کرنا غلط سمجھتے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام

قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کو سلیمان علیہ السلام جیسا باشرف بیٹا عطا فرمانے کی خبر دی گئی ہے کہ جو ان کی حکومت ورسالت کو باقی وجاری رکھنے والے تھے۔ارشاد ہوتا ہے: ''ہم نے داؤد علیہ السلام کو سلیمان علیہ السلام عطا کیا، کیا ہی اچھا بندہ تھا کیونکہ وہ ہمیشہ دامن خدا کی طرف اور آغوش حق کی طرف لوٹتا تھا''۔[1]

قرآن مجید؛ موجودہ توریت کے برخلاف کہ جو سلیمان علیہ السلام کو ایک جبار، بت خانہ ساز اور عورتوں کی ہوس میں مبتلا بادشاہ کے طور پر متعارف کراتی ہے۔سلیمان علیہ السلام کو خدا کا ایک عظیم پیغمبر شمار کرتا ہے، اور انہیں قدرت اور بے نظیر حکومت کے نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہے، اور سلیمان علیہ السلام سے مربوط مباحث کے دوران بہت ہی عظیم درس انسانوں کو دیتا ہے، ان داستانوں کے ذکر کرنے کا اصل مقصد وہی ہے۔

خدا نے اس بزرگ پیغمبر کو بہت ہی عظیم نعمتیں عطا فرمائی تھیں۔

بہت ہی سریع اور تیز رو سواری کہ جس کے ذریعے وہ مختصر سی مدت میں اپنے سارے ملک کی سیر کر سکتے تھے۔

مختلف صنعتوں کے لئے فراواں معدنی مواد۔

اس معدنی مواد کو استعمال کرنے کے لئے کافی فعال قوت۔

انہوں نے ان وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑے بڑے عبادت خانے بنائے اور لوگوں کو عبادت کی طرف ترغیب دی، علاوہ ازیں حکومت کی فوجوں، کارکنوں اور کمزور لوگوں کے طبقات کی پذیرائی کے لئے وسیع وعریض پروگرام منظم کیا، کہ جس کے برتنوں کے نمونہ سے، باقی چیزوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ان تمام نعمتوں کے مقابلہ میں انہیں شکر گزاری کا حکم دیا، اس مطلب پر تاکید کرتے ہوئے کہ خدا کی نعمتوں کے شکر کا حق بہت ہی کم لوگ ادا کر سکتے ہے۔

اس کے بعد یہ واضح وروشن کیا کہ ایک شخص اس قدرت وعظمت کے باوجود موت کے مقابلہ میں کتنا کمزور اور ناتواں تھا، کہ وہ ایک ہی لحہ میں ناگہانی موت کے ذریعہ دنیا سے چل بسا، اس طرح سے کہ اجل نے اسے بیٹھنے یا بستر پر لیٹنے کی مہلت بھی نہ دی، تاکہ مغرور سرکشی کرنے والے یہ گمان نہ کرلیں۔

---

[1] سورہ ص آیت 30

کہ اگر وہ کسی مقام پر پہنچ جائیں اور قدرت وقوت حاصل کرلیں تو واقعی طور پر وہ توانا ہو گئے ہیں، وہ جس کے سامنے جن اور انسان، شیطان و پری خدمت میں لگے ہوئے تھے۔

اور زمین وآسمان جس کی جولانگاہ تھے، اور جس کی حشمت اور شان وشوکت میں جو بھی شک کرے اس کی عقل وفکر پر مرغ و ماہی قہقہہ لگائیں، اور وہ ایک مختصر سے لمحہ میں سمندر کی موجوں پر ابھرنے والے بلبلے کی طرح محو ونابود ہو گیا۔

اور یہ بھی واضح وروشن کردے کہ ایک ناچیز عصا اسے ایک مدت تک کس طرح اٹھائے رہا اور ''جن'' اسے کھڑے ہوئے یا بیٹھے ہوئے دیکھتے رہنے کی وجہ سے کیسے سرگرمی کے ساتھ اپنے کاموں میں مشغول رہے؟

اور یہ بھی (دکھادے) کہ دیمک نے انہیں کس طرح زمین پر گرایا اور ان کے ملک کے تمام رشتوں کو توڑ کے رکھ دیا۔ ہاں ایک عصا ہی اس وسیع وعریض ملک کی فعال قوت کو بروئے کار لائے ہوئے تھا اور ایک چھوٹی سے دیمک نے اس کو حرکت سے روک دیا۔

سلیمان علیہ السلام کا سخت امتحان

قرآن میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی کا ایک دوسرا حصہ بیان کیا کہ اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو آزمایا۔ اس میں ایک ''ترک اولیٰ'' پیش آیا۔ اس کے بعد جناب سلیمان علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی کا رخ کیا اور اس ترک اولیٰ پر توبہ کی۔[1] قرآن کہتا ہے: ''ہم نے سلیمان علیہ السلام کا امتحان لیا اور اس کی کرسی پر ایک دھڑ ڈال دیا، پھر اس نے بارگاہ خداوندی کی طرف رجوع کیا اور اس کی طرف لوٹا''۔[2]

کلام الٰہی سے اجمالی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی آزمائش بے جان دھڑ کے ذریعے ہوئی تھی وہ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے تخت پر رکھ دیا گیا تھا لیکن اس سلسلے میں قرآن میں کوئی وضاحت نہیں۔ محدثین ومفسرین نے اس سلسلے میں روایات تفاسیر بیان کی ہیں ان میں سے زیادہ قابل توجہ اور واضح یہ ہے کہ: سلیمان علیہ السلام کی آرزو تھی کہ انہیں باشرف اور شجاع اولاد نصیب ہو جو ملک کا نظام چلانے اور خاص طور پر دشمنوں کے خلاف جہاد میں ان کی مدد کرے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی متعدد بیویاں تھیں۔ انھوں نے دل میں ارادہ کیا کہ میں ان سے ہم بستر ہوتا ہوں تاکہ مجھے متعدد بیٹے نصیب ہوں کہ جو میرے مقاصد میں میری مدد کریں۔

لیکن اس مقام پر ان سے غفلت ہوئی اور آپؑ نے ''انشاء اللہ'' نہ کہا کہ جو انسان کے ہر حالت میں اللہ پر تکیہ کا غماز ہے۔

لہٰذا اس زمانے میں ان کی بیویوں سے کوئی اولاد نہ ہوئی سوائے ایک ناقص الخلقت بچے کے۔ وہ بے جان دھڑ کے مانند تھا کہ جو لاکر ان کے تخت پر ڈال دیا گیا۔

سلیمان علیہ السلام سخت پریشان اور فکرمند ہوئے کہ انھوں نے ایک لمحے کے لئے اللہ سے غفلت کیوں کی اور کیوں اپنی طاقت

---

[1] قرآن مجید میں چونکہ یہ واقعہ مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے لہٰذا افسانہ طرازوں اور خیال پردازوں نے فائدہ اٹھایا اور بے بنیاد خیالی داستانیں بناڈالیں۔ انھوں نے اس عظیم نبی کی طرف بعض ایسی چیزیں منسوب کیں جو یا تو اساس نبوت کے خلاف ہیں یا مقام عصمت کے منافی ہیں یا اصولی عقل ومنطق ہی کے برخلاف ہیں۔ یہ باتیں تمام محققین قرآن کے لئے خود ایک آزمائش ہیں۔ حالانکہ قرآن کے متن میں جو کچھ کہا گیا ہے اگر اسی پر قناعت کرلی جاتی تو ان بے ہودہ افسانوں کی گنجائش باقی نہ رہتی۔

[2] سورہ ص، آیت 36

پر بھروسہ کیا اس لئے انھوں نے توبہ کی اور بارگاہ الٰہی کی طرف رجوع کیا۔ [1]

قرآن نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی توبہ کا مسئلہ پھر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

''اس نے کہا: پروردگار مجھے بخش دے۔ اور مجھے ایسی حکومت عطا کر جو میرے بعد کسی کے شایاں نہ ہو کیونکہ تو ہی بہت عطا کرنے والا ہے''۔ [2]

سلیمان علیہ السلام کی وسیع حکومت

اللہ نے سلیمان علیہ السلام کی درخواست قبول کر لی اور انہیں خصوصی امتیازات اور عظیم نعمات والی حکومت عطا کی۔ ان امتیازات ونعمات کا پانچ حصوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

ہواؤں پر قبضہ

خدا کی پہلی نعمت تھی ہواؤں کا ایک رہوار اور سواری کی طرح تابع ہونا۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے: ''ہم نے ہوا کو اس کے تابع کر دیا تا کہ اس کے حکم کے مطابق آرام سے چلے اور جہاں کا وہ ارادہ کرے جا سکے''۔ [3] واضح ہے کہ ایک وسیع وعریض حکومت میں تیز رفتار رابطوں کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ بوقت ضرورت سربراہ حکومت تیزی کے ساتھ ملک کے تمام علاقوں میں آ جا سکے۔ اللہ نے یہ امتیاز حضرت سلیمان علیہ السلام کو دے رکھا تھا۔ [4]

جنوں پر بھی حکومت

دوسری نعمت اللہ تعالیٰ نے جناب سلیمان علیہ السلام کو یہ عطا کی تھی کہ سرکش موجودات ان کے لئے مسخر کر دیئے گئے تھے اور ان کے لئے اختیار میں دے دیئے گئے تھے تا کہ آپؑ ان سے مثبت کام لے سکیں۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا: خلاصہ یہ کہ وہ کیسا اسرار آمیز وسیلہ تھا کہ جو اس زمانے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے قبضے میں تھا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کی جزئیات اور خصوصیات کے بارے میں جواب ہمارے سامنے واضح نہیں ہے ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ یہ ایک معجزہ تھا جیسے معجزے نبی کے اختیار میں دیئے

---

[1] ''کرسی'' کا معنی ہے ''چھوٹے پاؤں والا تخت'' یوں معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہوں کے پاس دو طرح کے تخت ہوتے تھے۔ ایک تخت عام استعمال کے لئے ہوتا تھا جس کے پاؤں چھوٹے ہوتے تھے اور دوسرا تخت خصوصی پروگراموں کے لئے ہوتا تھا کہ جس کے پائے بلند ہوتے تھے۔ پہلی قسم کے تخت کو ''کرسی'' کہا جاتا تھا اور دوسری قسم کے تخت کو ''عرش'' کہتے تھے۔

باقی رہے جھوٹے اور قبیح افسانے کہ جن کا ذکر بعض کتب میں بڑی آب وتاب سے کیا گیا ہے۔ ظاہراً ان کی جڑ تلمود کے یہودیوں کی طرف جاتی ہے اور یہ سب اسرائیلیات اور خرافات ہیں کوئی عقل ومنطق انہیں قبول نہیں کرتی۔ ان قبیح افسانوں میں کہا گیا ہے سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی کھو گئی تھی یا وہ کسی شیطان نے چھین لی تھی اور خود ان کی جگہ تخت پر آ بیٹھا تھا وغیرہ وغیرہ۔

یہ افسانے ہر چیز سے قبل انہیں گھڑنے والوں کے انحطاط فکری کی دلیل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محققین اسلام نے جہاں کہیں ان کا نام لیا ہے ان کے بے بنیاد ہونے کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ نہ تو مقام نبوت اور حکومت الٰہی انگوٹھی سے وابستہ ہے اور نہ کبھی یہ مقام اللہ اپنے کسی نبی سے چھینتا ہے اور نہ کبھی شیطان کو نبی کی شکل میں لاتا ہے، چہ جائیکہ افسانہ طرازوں کے مطابق وہ چالیس دن تک نبی کی جگہ پر بیٹھے اور لوگوں کے درمیان حکومت وقضاوت کرے۔

[2] سورہ ص آیت 35

[3] سورہ ص، آیت 36

[4] ہوا کیسے ان کے تابع فرمان تھی؟ کتنی تیزی سے چلتی تھی؟ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ان کے ساتھی ہوا کے ذریعہ سفر کرتے ہوئے کس چیز پر سوار ہوتے تھے؟ اور کون سے عوامل انہیں گرنے سے بچاتے تھے اور ہوا کے دباؤ کی کمی بیشی اور دیگر مشکلات کے مواقع پر ان کی حفاظت کرتے تھے؟

جاتے تھے۔ یہ ایک عام اور معمول کے مطابق بات نہ تھی۔ یہ ایک عظیم نعمت اور اعجاز تھا اور ایسا کرنا قدرت الٰہی کے لئے سادہ اور آسان کام ہے۔ نیز ایسے بہت سے مسائل ہیں کہ اصولی طور پر تو ہم انہیں جانتے ہیں لیکن ان کی جزئیات سے ہم واقف نہیں ہیں۔

''اور ہم نے شیطانوں کو اس کے لئے مسخر کر دیا اور ان میں سے ہر معمار اور غواص کو اس کا تابع فرمان بنا دیا''۔ [1]

تا کہ ان میں سے کچھ خشکی میں اس کے کہنے کے مطابق تعمیرات کریں اور کچھ دریا میں غواصی اور غوطہ زنی کے کام آئیں۔

اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے مثبت کاموں کے لئے موجود قوت ان کے اختیار میں دے دی۔ شیطان کہ جن کے مزاج ہی میں سرکشی ہے وہ ان کے لئے اس طرح سے مسخر ہو گئے کہ ان سے تعمیری اور اصلاحی کام لیا جانے لگا اور گراں بہا منابع سے استفادہ کے لئے وہ استعمال ہونے لگے۔

قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ شیطان حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع فرمان تھے اور ان کے حکم کے مطابق مثبت کام کرتے تھے۔ البتہ بعض مقامات پر ''شیاطین'' کا لفظ ہے، جبکہ بعض مقامات پر ''جن'' کا لفظ ہے۔

''جن'' ایک ایسا موجود ہے جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے لیکن عقل و شعور اور طاقت کا حامل ہے۔ نیز جنوں میں مومن بھی ہیں اور کافر بھی اور اس میں کوئی مانع نہیں کہ حکم خدا سے وہ ایک نبی کے تابع فرمان ہو جائیں اور مفید کام انجام دیں۔ [2]

جنوں کے بارے میں لوگوں نے بہت سے بیہودہ افسانے اور داستانیں گھڑ رکھی ہیں، لیکن اگر ہم ان خرافات کو ترک کر دیں، تو ان کا اصل وجود اور مخصوص صفات، جو قرآن میں جنوں کے لئے بیان ہوئی ہیں، ایک ایسے مطلب کا حامل ہے جو علم و عقل سے قطعاً بعید نہیں ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ طاقت دی تھی کہ وہ تمام سرکشوں کو اپنے سامنے جھکا سکیں۔ جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عظیم طاقت کی تسخیر بھی پروردگار کے فرمان سے ہی تھی ''اور جس وقت وہ اپنے وظائف اور ذمہ داریوں سے سرتابی کرتے تھے تو انہیں سزا دی جاتی تھی''۔ [3]

قرآن کریم واقعہ کو جاری رکھتے ہوئے جنوں کے اہم تولیدی کاموں کے ایک حصہ کی طرف (جو وہ سلیمان علیہ السلام کے حکم سے انجام دیتے تھے) اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

''سلیمان علیہ السلام جو کچھ چاہتے تھے وہ ان کے لئے، عبادت خانوں، تمثالوں، حوض کے مانند بڑے بڑے کھانوں کے برتنوں اور زمین میں ثابت (جمی ہوئی یا گڑی ہوئی) دیگوں سے، تیار کر کے دیتے تھے''۔ [4]

ان میں سے ایک حصہ تو معنوی اور عبادت کے مسائل سے مربوط تھا، اور ایک حصہ انسانوں کی جسمانی ضروریات اور ان کے عظیم لشکریوں اور کارکنوں کی جمعیت کے ساتھ تعلق رکھتا تھا۔

بہر حال سلیمان علیہ السلام کے یہ فعال اور چابک دست کارندے، بڑے بڑے باشکوہ عبادت خانے، کہ جو حکومت الٰہیہ اور اس

---

[1] سورہ ص، آیت 37

[2] یہ احتمال بھی ہے کہ لفظ ''شیاطین'' کا ایک وسیع تر معنی ہو کہ جس میں سرکش انسان بھی شامل ہوں اور ان کے علاوہ بھی۔ لفظ ''شیطان'' کا اطلاق قرآن مجید میں اس وسیع مفہوم پر ہوا ہے۔ (مثلاً سورہ انعام کی آیت 12)

[3] سورہ سباء آیت 12

[4] سورہ سباء آیت 13

کی مذہبی سلطنت کے لائق تھے،

اس کے لئے بناتے تھے تا کہ لوگ راحت وآرام کے ساتھ اپنے عبادت کے فرائض کو انجام دے سکیں۔

تماثیل کہ جسکا نام قرآن میں لیا گیا ہے ''تمثال'' کی جمع ہے۔ یہ بیل بوٹو اور تصویر کے معنی میں آیا ہے، اور مجسمہ کے معنی میں بھی،

اس بارے میں کہ یہ مجسمے یا نقوش، کون سے موجودات کی صورتیں تھیں، اور سلیمان علیہ السلام نے ان کی تیاری کا حکم کیوں دیا تھا، مختلف تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔

ممکن ہے کہ یہ زیب وزینت اور سجاوٹ کا پہلو رکھتے ہوں، جیسا کہ ہماری اہم قدیمی بلکہ جدید عمارتوں میں بھی نظر آتا ہے۔ یا یہ ان عمارتوں کا رعب اور دبدبہ بڑھانے کے لئے ہو، کیونکہ کچھ حیوانات مثلاً شیر کی تصویر، بہت سے لوگوں کے افکار میں رعب و دبدبہ پیدا کرنے والی ہے۔[1]

شیاطین زنجیروں میں

تیسری نعمت اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ عنایت کی تھی کہ انھوں نے تخریب کار اور فسادی قوتوں پر قابو پا رکھا تھا، کیونکہ بہر حال بعض شیاطین ایسے بھی تھے کہ جن سے ایک مفید اور اصلاحی قوت کے طور پر کام نہیں لیا جا سکتا تھا اور اس کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہ تھا کہ وہ قید و بند میں رہیں تا کہ معاشرہ ان کی مزاحمت سے پیدا ہونے والے شر سے محفوظ رہے۔ جیسا کہ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ: ''اور شیطانوں کا ایک اور گروہ اس کے قابو میں زنجیروں سے جکڑا ہوا تھا''۔[2]

چوتھی نعمت اللہ تعالیٰ نے جناب سلیمان کو یہ دی تھی کہ انہیں بہت سے اختیارات دے رکھے تھے کہ جن کی وجہ سے کسی کو کچھ عطا کرنے اور یا نہ کرنے میں وہ صاحب اختیار تھے۔ جیسا کہ قرآن نے کہا ہے کہ: ''ہم نے اس سے کہا: یہ ہماری عطا و بخشش ہے جسے تو (مصلحت کے مطابق) چاہتا ہے عطا کر اور جس سے تو (مصلحت کے مطابق) روکنا چاہتا ہے روک لے تجھ پر کوئی حساب نہیں

---

[1] کیا سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں ذی روح موجودات کا مجسمہ بنانا جائز تھا۔ جبکہ یہ اسلام میں ممنوع ہے؟

یا جو مجسمے وہ سلیمان علیہ السلام کے لئے بناتے تھے، غیر ذی روح کی جنس سے تھے، مثلاً درختوں پہاڑوں، سورج، چاند اور ستاروں کی تصویریں۔ یا ان کے لئے صرف دیواروں پر نقش ونگار کیا کرتے تھے جیسا کہ قدیمی تاریخی آثار میں اکثر گلکاروں کی صورت میں نظر آتی ہیں، اور ہم یہ جانتے ہیں کہ نقش ونگار چاہے جیسے بھی ہوں، مجسمہ کے برخلاف، حرام نہیں ہیں۔

یہ سب احتمالات ہیں، چونکہ اسلام میں مجسمہ سازی کو حرام قرار دیا جاتا ہے ممکن ہے کہ بت پرستی کے مسئلہ کے ساتھ شدید مبارزہ کرنے اور اس کی بیخ کنی کی خاطر ہو، اور سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں اس بات کی اتنی ضرورت نہ ہو، اور یہ حکم ان کی شریعت میں نہ ہو۔ لیکن ایک روایت میں جو امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے یہ بیان کیا گیا ہے:

''خدا کی قسم سلیمان علیہ السلام کے حکم سے بنائی جانے والی تمثال مردوں اور عورتوں کے مجسمے نہ تھے، بلکہ درخت وغیرہ کی تصویریں تھیں''۔

پس معلوم ہوا کہ ذی روح کا مجسمہ بنانا ان کی شریعت میں بھی حرام تھا۔

[2] سورہ ص، آیت 38

البتہ یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ''شیاطین'' سے مراد ''شیاطین جن'' ہیں کہ جو فطری طور پر جسم لطیف رکھتے ہیں او پھر زنجیر اور ہتھکڑیاں ان کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتیں۔ اس لئے بعض نے کہا ہے کہ یہ تعبیر انہیں تخریبی کاروائیوں سے باز رکھنے کے معنی کے لئے کنایہ ہے۔

ہے''۔[1]

پانچویں نعمت جو اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو دی وہ ان کا روحانی مقام تھا کہ جو اللہ نے ان کی اہلیت و قابلیت کی بناء پر انہیں مرحمت فرمایا تھا۔

جیسا کہ زیر بحث گفتگو میں قرآن نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے: ''اس کے لئے ہمارے پاس بلند مقام اور نیک انجام ہے''۔[2]

یہ جملہ درحقیقت ان لوگوں کا جواب ہے جنھوں نے اس عظیم نبی کے مقام مقدس پر طرح طرح کی ناروا اور بے ہودہ تہمتیں لگانے میں موجودہ توریت کی پیروی کی۔

اس آیت میں قرآن حضرت سلیمان علیہ السلام کو تمام تہمتوں سے مبرا قرار دے رہا ہے اور خدا کے یہاں ان کے معزز مقام کی خبر دے رہا ہے۔

یہاں تک کہ ''حسن مآب'' کہہ کر ان کے انجام بخیر کی خبر بھی دی گئی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ توریت میں آنے والی اس ناروا نسبت کی نفی ہو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بت پرستوں میں شادی کی تھی۔

جس وجہ سے ان کا میلان بت پرستی کی طرف ہوگیا تھا۔ موجودہ توریت یہاں تک کہتی ہے کہ انھوں نے بت خانہ بنایا تھا، لیکن قرآن ''حسن مآب'' کہہ کر ان تمام اوہام و خرافات پر خط بطلان کھینچ رہا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام وادی نمل میں

قرآنی آیات سے یہ بات بخوبی سمجھی جاتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی داستان حکومت کوئی عام سا واقعہ نہیں ہے۔

درحقیقت خداوند عالم نے ایسی عظیم حکومت کے قیام اور اتنی عظیم طاقتیں جناب سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کر کے اپنی قدرت کا مظاہرہ فرمایا ہے اور ایک مؤحد انسان کے نزدیک قدرت خدا کے آگے یہ کام بالکل آسان ہے۔ قرآن میں سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: ''سلیمان علیہ السلام کے پاس جنوں، انسانوں اور پرندوں کے لشکر کے لشکر جمع ہوگئے''۔[3]

لشکر والوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کے لئے حکم دیا جاتا کہ ''اگلی صفوں کو روکے رکھیں اور پچھلی صفوں کو چلاتے رہیں تاکہ سب مل کر حرکت کریں''۔[4]

حضرت سلیمان علیہ السلام نے کسی علاقے پر لشکر کشی کی تھی لیکن اس لشکر کشی کی تفصیل واضح طور پر معلوم نہیں ہے۔ چونکہ قرآن ''وادی نمل'' کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔

لہٰذا بعض مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ وہ ''وادی النمل'' (چیونٹیوں کی سرزمین) طائف کے قریب کا علاقہ ہے اور بعض نے کہا

---

[1] سورہ ص، آیت 38

''بغیر حساب'' یا تو اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے تیرے مقام عدالت کی بناء پر تجھے وسیع اختیارات دیئے ہیں اور تجھ سے پوچھ گچھ نہ ہوگی، یا اس کا معنی یہ ہے کہ عطائے الٰہی تجھ پر اس قدر ہے کہ جس قدر بھی تو بخشش دے اس میں حساب نہیں ہوگا۔

[2] سورہ ص، آیت 40

[3] سورہ نمل آیت 17

[4] سورہ نمل آیت 17

ہے کہ وہ شام کے نزدیک کی سرزمین ہے۔ ''بہرحال جناب سلیمان علیہ السلام اس عظیم لشکر کے ساتھ چلے حتیٰ کہ چیونٹیوں کی سرزمین پر پہنچ گئے''۔[1]

یہاں پر چیونٹیوں میں سے ایک چیونٹی نے دوسری چیونٹیوں سے مخاطب ہوکر کہا: ''اے چیونٹیو اپنے اپنے بلوں میں چلی جاؤ تاکہ سلیمان علیہ السلام اور ان کا لشکر تمہیں بے خبری میں پامال نہ کردے۔''[2]

''سلیمان علیہ السلام یہ سن کر مسکرادیئے اور ہنسے''۔[3]

حضرت سلیمان علیہ السلام کس وجہ سے ہنسے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ظاہر امر یہ ہے کہ بذات خود یہ قضیہ ایک عجیب چیز تھی کہ ایک چیونٹی اپنے ساتھیوں کو سلیمان علیہ السلام کے عظیم لشکر سے آگاہ کرے اور اس کی بے توجہی کا ذکر کرے اور یہی عجب امر جناب سلیمان علیہ السلام کے ہنسنے اور مسکرانے کا سبب بنا۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ آپؑ کی یہ ہنسی، خوشی کی ہنسی تھی کیونکہ آپؑ کو معلوم ہوگیا کہ چیونٹی تک کی مخلوق ان کی اور ان کے لشکر والوں کی عدالت اور تقویٰ کا اعتراف کرتی ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آپؑ کی خوشی کا سبب یہ تھا کہ خداوند عالم نے انہیں ایسی قدرت عطا فرمائی ہے کہ لشکر عظیم کے شور و غل کے باوجود وہ چیونٹی جیسی مخلوق کی آواز سے غافل نہیں ہیں۔

بہرحال وجہ خواہ کچھ بھی ہو، اس موقع پر جناب سلیمان علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں چند معروضات پیش کیں۔ پہلی یہ کہ ''خداوند جو نعمتیں تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائی ہیں ان کا شکر کرنے کا طریقہ مجھے سکھادے''۔[4]

دوسری یہ کہ ''مجھے توفیق عطا فرما تاکہ ایسا نیک عمل بجالاؤں کہ جس سے تو راضی ہو''۔[5]

آخر میں تیسری عرضداشت یہ پیش کی کہ ''پروردگارا مجھے اپنی رحمت کے ساتھ اپنے صالح بندوں کے زمرے میں شامل فرما''۔[6]

جناب سلیمان علیہ السلام کا جانوروں کی بولی جاننا

حیوانات کی دنیا کے بارے میں ہمیں زیادہ معلومات نہیں ہیں اور اس بارے میں تمام ترقی کے باوجود ابھی تک اس پر شک و ابہام کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ البتہ بہت سے کاموں میں ہم ان کی فہم، سمجھ اور مہارت کے آثار ضرور دیکھتے ہیں۔

شہد کی مکھیوں کا گھر بنانا، شہد کے چھتے کا منظم و مضبوط کرنا، چیونٹیوں کا موسم سرما کی ضروریات کے لئے اپنی غذا کو جمع کرنا۔

---

[1] سورہ نمل آیت 18

البتہ ضمنی طور پر اس جملے سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ سلیمانؑ کی عدالت چیونٹیوں تک پر آشکار ہوگئی کیونکہ اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ اگر وہ اس بات کی طرف متوجہ ہوں تو ایک کمزور سی چیونٹی کو بھی پامال کرنا گوارا نہیں کرتے چنانچہ اگر وہ پامال کرتے ہیں تو ان کی اس طرف توجہ نہیں ہوتی۔

[2] سورہ نمل آیت 18

[3] سورہ نمل آیت 19

[4] سورہ نمل آیت 19

[5] سورہ نمل آیت 19

[6] سورہ نمل آیت 19

سلیمان علیہ السلام اپنی فوجی طاقت کا مظاہرہ دیکھتے ہیں

قرآن میں موجود مختلف قرائن سے مجموعی طور پر نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک روز حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے تیز رفتار گھوڑوں کا معائنہ کررہے تھے کہ جنھیں میدان جہاد کے لئے تیار کیا گیا تھا۔عصر کا وقت تھا۔ مامورین مذکورہ گھوڑوں کے ساتھ مارچ کرتے ہوئے ان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

ایک عادل اور بااثر حکمران کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس طاقتور فوج ہو اور اس زمانے میں لشکر کے اہم ترین وسائل میں سے تیز رفتار گھوڑے تھے لہٰذا حضرت سلیمان علیہ السلام کا مقام ذکر کرنے کے بعد نمونے کے طور پر گھوڑوں کا ذکر آیا ہے۔

ذخیرہ کرنا، جانوروں کا دشمن سے اپنا دفاع کرنا، حتیٰ کہ ان کا بہت سی بیماریوں کے علاج سے باخبر ہونا دور دراز کے فاصلوں سے اپنے آشیانوں اور بلوں تک واپس لوٹ آنا، لمبے اور طویل فاصلے طے کر کے منزل مقصود تک پہنچنا، آئندہ حوادث کے بارے میں پیشگی اندازہ لگا لینا وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حیوانات کی پراسرار زندگی کے بارے میں ابھی تک بہت سے مسائل ایسے ہیں جو قابل حل نہیں۔ان تمام باتوں سے ہٹ کر بہت سے جانور ایسے ہیں کہ اگر انہیں سدھایا جائے اور ان کی تربیت کی جائے تو وہ ایسے ایسے عجیب وغریب کارنامے انجام دیتے ہیں جو انسان کے بھی بس میں نہیں ہوتے۔

لیکن پھر بھی اچھی طرح معلوم نہیں کہ وہ انسانی دنیا سے کس حد تک باخبر ہیں؟ کیا وہ واقعاً یہ جانتے ہیں کہ ہم (انسان) کون لوگ ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ ہوسکتا ہے ہمیں ان میں اس قسم کے ہوش اور سمجھ کے آثار نہ ملیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ان میں ان چیزوں کا فقدان ہے۔اسی بناء پر اگر ہم نے مندجہ بالا داستان میں یہ پڑھا ہے کہ چیونٹیوں کو جناب سلیمان کے اس سرزمین میں آنے کی خبر ہوگئی تھی اور انہیں اپنے بلوں میں گھس جانے کا حکم ملا تھا تا کہ وہ لشکر کے پاؤں تلے کچلی نہ جائیں اور سلیمان علیہ السلام بھی اس بات سے باخبر ہوگئے تھے تو زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے۔

اس کے علاوہ، سلیمان علیہ السلام کی حکومت غیر معمولی اور معجزانہ امور پر مشتمل تھی اسی بناء پر بعض مفسرین نے اپنے نظریہ کا اس طرح اظہار کیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے دور حکومت میں بعض جانوروں میں اس حد تک آگاہی کا پایا جانا ایک اعجاز اور خارق العادۃ بات تھی لہٰذا اگر دوسرے ادوار میں اس قسم کی باتیں جانوروں میں نہیں ملتیں تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ان کی اس قسم کی گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں سلیمان علیہ السلام اور چیونٹیوں یا سلیمان علیہ السلام اور ہدہد کی داستان کو کنایہ، مجاز یا زبان حال وغیرہ پر محمول کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔کیونکہ ظاہر امر کی حفاظت اور حقیقی معنی پر محمول کرنے کا امکان بھی موجود ہے۔

قرآن میں اس طرح بیان ہوا ہے کہ ''وہ وقت یاد کرو جب وقت عصر انھوں نے چابک اور تیز رفتار گھوڑے اس کے سامنے پیش کئے''۔[1]

اس موقع پر یہ واضح کرنے کے لئے کہ طاقتور گھوڑوں سے ان کا لگاؤ دنیا پرستی کی وجہ سے نہیں جناب سلیمان علیہ السلام نے کہا:

''ان گھوڑوں کو میں اپنے رب کی یاد اور اس کے حکم کی بنا پر پسند کرتا ہوں''۔[2]

میں چاہتا ہوں کہ ان سے دشمنوں کے خلاف جہاد میں کام لوں۔

---

[1] سورہ نمل آیت 31

[2] سورہ ص، آیت 32

سلیمان علیہ السلام کہ جو دشمن کے خلاف جہاد کے لئے آمادہ ان تیز رفتار گھوڑوں کا معائنہ کر رہے تھے بہت خوش ہوئے۔

آپؑ انہیں یوں دیکھ رہے تھے کہ نظریں ان پر جم کر رہ گئیں ''یہاں تک کہ وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔''[1]

یہ منظر نہایت دلکش اور عمدہ تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے عظیم فرماں روا کے لئے نشاط انگیز تھا۔ آپؑ نے حکم دیا ''ان گھوڑوں کو واپس میرے پاس لاؤ''۔[2]

''جب مامورین نے اس حکم کی اطاعت کی اور گھوڑوں کو واپس لائے تو سلیمان علیہ السلام نے خود ذاتی طور پر ان پر نوازش کی اور ان کی پنڈلیوں اور گردنوں کو تھپتھپایا اور ہاتھ پھیرا۔''[3]

یوں آپؑ نے ان کی پرورش کرنے والوں کی بھی تشویق اور قدردانی کی۔

معمول ہے کہ جب کسی سواری کی قدردانی کی جاتی ہے تو اس کے سر، چہرے گردن یا اس کی ٹانگ پر ہاتھ پھیرا جاتا ہے اور یہ دلچسپی اور پسندیدگی کے اظہار کا اہم ذریعہ ہے کہ جس سے انسان اپنے بلند مقاصد میں مدد لیتا ہے لہٰذا حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے نبی کا ایسا کرنا کوئی تعجب انگیز نہیں۔[4]

داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا فیصلہ

قرآن میں دوسری جگہ داؤد علیہ السلام و سلیمان علیہ السلام کی زندگی کے ایک حصہ کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ ابتداء میں ایک فیصلہ کا ذکر ہے کہ جو حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام نے کیا تھا۔ ایک اجمالی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

''اور داؤد علیہ السلام و سلیمان علیہ السلام کو یاد کرو کہ جس وقت وہ ایک کھیت کے بارے میں فیصلہ کر رہے تھے کہ جس کو ایک قوم کی بھیڑیں رات کے وقت چر گئی تھیں، اور ہم ان کے فیصلے کے شاہد تھے''۔[5]

اگرچہ قرآن نے اس فیصلے کا واقعہ کا ملاً سربستہ طور پر بیان کیا ہے۔ اور ایک اجمالی اشارہ پر ہی اکتفا کیا ہے، اور صرف اس کے اخلاقی اور تربیتی نتیجہ پر کہ جس کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے قناعت کی ہے، لیکن اسلامی روایات اور مفسرین کے بیانات میں اس سلسلے میں بہت سی بحثیں نظر آتی ہیں۔

کچھ مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ واقعہ اس طرح تھا: کہ بھیڑوں کا ایک ریوڑ رات کے وقت انگوروں کے ایک باغ میں داخل ہو گیا اور انگوروں کی بیلوں اور انگوروں کے گچھوں کو کھا گیا اور انہیں خراب اور ضائع کر دیا۔

باغ کا مالک حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس شکایت لے کر پہنچا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے حکم دیا کہ اس اتنے بڑے نقصان کے

---

[1] سورہ ص، آیت 32

[2] سورہ ص، آیت 33

[3] سورہ ص، آیت 33

[4] مذکورہ بیان کے بارے میں جو کچھ سطور بالا میں کہا گیا ہے یہ بعض مفسرین سے ہم آہنگ ہے۔ بزرگان شیعہ میں سے عالم نامدار و بزرگوار سید مرتضی کے کلمات سے بھی اس تفسیر کے ایک حصّے کا استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب ''تنزیہ الانبیاء'' میں بعض مفسرین اور ارباب حدیث کی جانب سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف دی جانے والی ناروا نسبتوں کی نفی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کیسے ممکن ہے کہ اللہ پہلے تو اس پیغمبر کی مدح و ثناء کرے اور پھر ساتھ ہی اس کی طرف اس برے کام کی نسبت دے کہ وہ گھوڑوں سے بھی ان کا لگاؤ حکم پروردگار سے تھا کیونکہ اللہ ہمیں بھی حکم دیتا ہے کہ گھوڑے پالیں اور دشمنوں کے خلاف جنگ کے لئے انہیں آمادہ رکھیں۔ لہٰذا کیا مانع ہے کہ اللہ کا نبی بھی ایسا ہی ہو''۔

[5] سورہ انبیاء آیت 78

بدلے میں تمام بھیڑیں باغ کے مالک کو دے دی جائیں۔

سلیمان علیہ السلام جو اس وقت بچے تھے باپ سے کہتے ہیں کہ، اے خدا کے عظیم پیغمبر آپ اس حکم کو بدل دیں اور منصفانہ فیصلہ کریں باپ نے کہا کہ وہ کیسے؟ آپؑ جواب میں کہتے ہیں کہ: بھیڑیں تو باغ کے مالک کے سپرد کی جائے تا کہ وہ ان کے دودھ اور اون سے فائدہ اٹھائے اور باغ کو بھیڑوں کے مالک کے حوالے کیا جائے تا کہ وہ اس کی اصلاح اور درستی کی کوشش کرے۔ جس وقت باغ پہلی حالت میں لوٹ آئے تو وہ اس کے مالک کے سپرد کر دیا جائے اور بھیڑیں بھی اپنے مالک کے پاس لوٹ جائیں گی (اور خدا نے سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کی تائید کی)۔

یہاں پر ایک اہم سوال باقی ہے: ان دونوں فیصلوں کی بنیاد اور معیار کیا تھا؟

اس سوال کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ معیار اور بنیاد خسارے اور نقصان کی تلافی کرنا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے غور کیا اور دیکھا کہ انگوروں کے باغ میں جو نقصان ہوا ہے، وہ بھیڑوں کی قیمت کے برابر ہے۔ لہٰذا انہوں نے حکم دیا کہ اس نقصان کی تلافی کرنے کے لئے بھیڑیں باغ کے مالک کو دے دی جائیں کیونکہ قصور بھیڑوں کے مالک کا تھا۔

(اس بات کی طرف توجہ رہے کہ بعض اسلامی روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ رات کے وقت بھیڑوں والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ریوڑ کو دوسروں کے کھیتوں میں داخل ہونے سے روکے اور دن کے وقت حفاظت کی ذمہ داری کھیتوں کے مالک کی ہے)۔

اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم کا ضابطہ یہ تھا کہ انہوں نے دیکھا کہ باغ کے مالک کا نقصان بھیڑوں کے ایک سال کے منافع کے برابر ہے۔ اس بناء پر فیصلہ تو دونوں نے حق و انصاف کے مطابق کیا ہے لیکن اس میں فرق یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ زیادہ گہرائی پر مبنی تھا، کیونکہ اس کے مطابق خسارہ ایک مشت نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس طرح خسارہ تدریجی طور پر پورا ہوتا اور یہ فیصلہ بھیڑوں والے پر بھی گراں نہ تھا۔

علاوہ ازیں نقصان اور تلافی کے درمیان ایک تناسب تھا، کیونکہ انگور کی جڑیں ختم نہیں ہوئی تھیں، صرف ان کا وقتی منافع ختم ہوتا تھا، اندازاً زیادہ منصفانہ فیصلہ یہ تھا کہ اصل بھیڑیں باغ کے مالک کو نہ دی جائیں، بلکہ اسے ان کا منافع دیا جائے۔

بہر حال سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کی اس صورت میں تائید کی گئی ہے: ''ہم نے یہ فیصلہ سلیمان علیہ السلام کو سمجھا دیا تھا''۔ [1]

اور ہماری تائید سے اس نے اس جھگڑے کے حل کی بہترین راہ معلوم کر لی۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ غلط تھا۔ کیونکہ قرآن ساتھ ہی کہتا ہے: ''ہم نے ان دونوں میں سے ہر ایک کو آگاہی اور فیصلے کی اہلیت اور علم عطا کیا تھا''۔ [2]

ہدہد اور ملکہ سبا کی داستان

قرآن کے ایک حصے میں خداوند عالم حضرت سلیمان علیہ السلام کی حیرت انگیز زندگی کے ایک اور اہم واقعے کی طرف اشارہ فرماتا ہے اور ہدہد اور ملکہ سباء کا قصہ بیان کرتا ہے، فرماتا ہے: ''سلیمان علیہ السلام کو ہدہد دکھائی نہ دیا تو وہ اسے ڈھونڈنے لگے''۔ [3]

---

[1] سورہ انبیاء آیت 79

[2] سورہ انبیاء آیت 79

[3] سورہ نمل آیت 20

یہ تعبیر اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کرتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی حکومت کے حالات اور ملک کی کیفیت کو اچھی طرح مدنظر رکھتے تھے یہاں تک کہ ایک پرندہ بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں تھا۔

سلیمان علیہ السلام کو کیسے معلوم ہوا کہ ہدہد غیر حاضر ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ اس وجہ سے کہ جب آپؑ سفر کرتے تو پرندے آپؑ کے سر پر سایہ کئے رہتے تھے۔

چونکہ اس وقت اس سائبان میں اسکی جگہ خالی نظر آئی لہٰذا انہیں معلوم ہوگیا کہ ہدہد غیر حاضر ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ سلیمان علیہ السلام کے نظم حکومت میں پانی کی تلاش کا کام ہدہد کے ذمہ تھا لہٰذا پانی کی ضرورت کے وقت جب اسے تلاش کیا گیا تو وہ نہیں ملا۔

بہر حال، اس گفتگو کی ابتداء میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: ''مجھے وہ دکھائی نہیں دے رہا ہے''، پھر فرمایا: ''یا یہ کہ وہ غائب ہے''۔

ممکن ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ کیا وہ کسی معقول عذر کے بغیر حاضر نہیں ہے یا معقول عذر کی وجہ سے غائب ہے۔

بہر صورت ایک با استقلال منظم اور طاقت ور حکومت میں یہی ہوتا ہے کہ ملک میں جو بھی اتار چڑھاؤ ہو وہ سربراہ حکومت کی نظر میں ہوحتیٰ کہ کسی پرندے کی حاضری اور غیر حاضری ایک عام ملازم کی موجودگی اور عدم موجودگی اس کے پیش نظر ہو اور یہ ایک بہت بڑا درس ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے دوسروں کو درس دینے اور حکم عدولی پر سزا دینے کی خاطر مندرجہ ذیل جملہ کہا تا کہ ہدہد کی غیر حاضری دوسرے پرندوں پر بھی اثر کرے چہ جائیکہ اہم عہدوں اور اعلیٰ مناصب پر فائز انسان، فرمایا: ''میں یقیناً اسے سخت سزا دوں گا''۔

''یا اسے ذبح کر ڈالوں گا، یا پھر وہ اپنی غیر حاضری کی میرے سامنے واضح دلیل پیش کرے''۔[1]

درحقیقت جناب سلیمان علیہ السلام نے غیر حاضری کی صورت میں یک طرفہ فیصلہ دینے کی بجائے خلاف ورزی ثابت ہوجانے پر سزا کی تنبیہ کی ہے اور اپنی اس تنبیہ میں بھی دو مراحل بیان کئے ہیں جو جرم کی نوعیت کے مطابق ہیں ایک مرحلہ بغیر موت کے سزا ہے اور دوسرا سزائے موت کا مرحلہ ہے۔

ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ انہیں اپنی حکومت اور طاقت کا گھمنڈ نہیں ہے بلکہ اگر ایک کمزور سا پرندہ بھی معقول اور واضح دلیل پیش کرے تو وہ اسے قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔

ہدہد ایک اہم خبر کے ساتھ

ہدہد کی غیر حاضری کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ہدہد واپس آ گیا اور سلیمان علیہ السلام کی طرف رخ کر کے کہنے لگا: ''مجھے ایک ایسی چیز معلوم ہوئی ہے جس سے آپؑ آگاہ نہیں ہیں، میں آپؑ کے لئے سرزمین سباء سے ایک یقینی (اور بالکل تازہ) خبر لایا ہوں''۔[2]

گویا ہدہد نے جناب سلیمان علیہ السلام کے چہرے پر غصے کے آثار دیکھ لئے تھے لہٰذا ان کی ناراضی دور کرنے کے لئے سب سے پہلے اس نے ایک ایسے اہم مطلب کی مختصر الفاظ میں خبر دی جس سے جناب سلیمان علیہ السلام اس قدر علم و دانش رکھنے کے باوجود بے خبر

---

[1] سورہ نمل آیت 21

[2] سورہ نمل آیت 22

تھے، جب ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے اس ماجرا کی تفصیل بیان کی۔[1]

اس کی گفتار کا طریقہ ایسا نہیں تھا جیسے چاپلوس درباریوں کا جابر بادشاہوں کے سامنے ہوتا ہے کہ کسی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے مدتوں خوشامد کرتے رہتے ہیں اپنے آپ کو ذرہ ناچیز بتلاتے ہیں پھر چاپلوسی اور خوشامد کے ہزاروں پردوں میں کوئی بات بادشاہ سلامت کے قدموں پر نثار کرتے ہیں اور کبھی بھی اپنی بات کھول کر بیان نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ پھول کی پتی سے بھی نازک کنایوں کا سہارا لیتے ہیں مبادا بادشاہ سلامت کی خاطر مبارک ملول ہو جائے۔

ہاں تو ہدہد نے واضح الفاظ کہہ دیا کہ میری غیر حاضری کسی دلیل کے بغیر نہیں تھی، میں ایک ایسی اہم خبر لایا ہوں جس سے آپ بھی بے خبر ہیں۔

ضمنی طور پر یہ تعبیر سب لوگوں کے لئے ایک بہت بڑا درس بھی ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ہدہد جیسی ایک چھوٹی سی مخلوق ایسی با ت جانتی ہو جس سے اپنے دور کے بہت بڑے دانشور بھی بے خبر ہوں۔ انسان کو نہیں چاہئے کہ اپنے علم و دانش پر گھمنڈ کرے چاہے وہ نبوت کے وسیع علم کا مالک سلیمان علیہ السلام ہی کیوں نہ ہو۔

بہرحال ہدہد نے ماجرے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا: ''میں سرزمین سباء میں چلا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک عورت وہاں کے لوگوں پر حکومت کر رہی ہے اسکے قبضے میں سب کچھ ہے خاص طور پر اس کا ایک بہت بڑا تخت بھی ہے''۔[2]

ہدہد نے ان تین جملوں میں ملک سباء کی تقریباً تمام خصوصیات بتا دیں اور وہاں کے طرز حکومت سے بھی سلیمان علیہ السلام کو باخبر کر دیا۔

پہلی خصوصیت تو یہ ہے وہ ایک ایسا آباد اور شاد ملک ہے جس میں ہر طرح کی نعمتیں اور سہولیات مہیا ہیں۔

دوسری یہ کہ ان لوگوں پر ایک عورت حکومت کر رہی ہے جس کا ایک نہایت ہی آراستہ دربار ہے حتیٰ کے سلیمان علیہ السلام کے دربار سے بھی زیادہ آراستہ کیونکہ ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت دیکھا ہوا تھا اس کے باوصف ہونے کے باوجود اس نے ملکہ سباء کے تخت کو ''عرش عظیم'' کے عنوان سے یاد کیا۔

ان الفاظ کے ساتھ اس نے سلیمان علیہ السلام کو یہ بات جتلا دی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ یہ تصور کر لیں کہ تمام جہان آپ کے قلم رو حکومت میں ہے اور صرف آپ کا تخت باعظمت ہے۔

سلیمان ہدہد کی یہ بات سن کر ایک گہری سوچ میں پڑ گئے لیکن ہدہد نے انہیں مزید سوچنے کی مہلت نہ دی اور فوراً ہی ایک اور بات پیش کر دی۔ اس نے کہا: ''جو عجیب و غریب اور تکلیف دہ چیز میں نے وہاں دیکھی ہے وہ یہ کہ میں نے دیکھا کہ وہ عورت اور اس کی قوم خدا کو چھوڑ کر سورج کے سامنے سجدہ کرتے ہیں''۔

''شیطان ان پر مسلط ہو چکا ہے اور اس نے ان کے اعمال کو ان کے لئے مزین کر رکھا ہے''۔[3]

(لہٰذا وہ سورج کو سجدہ کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں)۔

---

[1] یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے لشکر والے حتی کہ پرندہ تک کو بھی جو ان کے تابع فرمان تھے جناب سلیمان علیہ السلام نے اس قدر آزادی، امن و امان اور جسارت عطا کی ہوئی تھی کہ ہدہد نے کھل کر ان سے کہہ دیا: ''مجھے ایسی چیز معلوم ہوئی ہے جس کی آپ کو بھی خبر نہیں ہے''۔

[2] سورہ نمل آیت 23

[3] سورہ نمل آیت 24

(اس طرح سے) ''شیطان نے انہیں راہ حق سے روک رکھا ہے''۔[1]

وہ بت پرستی میں اس قدر غرق ہو چکے ہیں کہ مجھے یقین نہیں کہ وہ آسانی سے اس راہ سے پلٹ جائیں۔ ''وہ بالکل ہدایت نہیں پائیں گے''۔[2]

ہدہد نے ان الفاظ کے ساتھ ان کی مذہبی اور روحانی حیثیت بھی واضح کردی کہ وہ بت پرستی میں خوب مگن ہیں، حکومت آفتاب پرستی کو ترویج کرتی ہے۔ اور لوگ اپنے بادشاہ کے دین پر ہیں۔

ان کے بت کدوں اور دوسرے حالات سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس غلط راہ پر ڈٹے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ جنون کی حد تک محبت کرتے ہیں اور اپنی اس غلط روش پر فخر کرتے ہیں ایسے حالات میں جبکہ حکومت اور عوام ایک ہی ڈگر پر چل رہے ہیں ان کا ہدایت پانا بہت مشکل ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط ملکہ سبا کے نام

حضرت سلیمان علیہ السلام نے غور سے ہدہد کی باتی سنیں اور سوچنے لگے۔ ممکن ہے ان کا زیادہ گمان یہی ہو کہ یہ خبر سچی ہے اور اس کے جھوٹا ہونے پر کوئی دلیل بھی موجود نہیں ہے لیکن چونکہ یہ بات معمولی نہ تھی بلکہ ایک ملک اور ایک بڑی قوم کی تقدیر اس سے وابستہ تھی لہٰذا انھوں نے ایک فرد کی خبر پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ وہ اس حساس موضوع پر مزید تحقیق کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا اس طرح فرمایا:

''ہم اس بارے میں تحقیق کریں گے اور دیکھیں گے کہ آیا تو نے سچ کہا ہے یا جھوٹوں میں سے ہے''۔[3]

سلیمان علیہ السلام نے نہ تو ہدہد کو جھوٹا کہا اور نہ ہی بغیر دلیل کے اس کی بات کو تسلیم کیا بلکہ اس بارے میں تحقیقات کا حکم صادر فرمایا۔

بہر حال سلیمان علیہ السلام نے ایک نہایت مختصر لیکن جامع خط تحریر فرمایا اور ہدہد کو دے کر کہا: میرا یہ خط لے جاؤ اور ان کے پاس جا کر ڈال دو پھر لوٹ آؤ اور ایک کونے میں ٹھہر جاؤ اور دیکھو وہ کیا ظاہر ردعمل کرتے ہیں۔[4]

ملکہ سباء نے خط کھولا اور اسکے مندرجات سے آگاہی حاصل کی چونکہ اس نے اس سے پہلے سلیمان علیہ السلام کا نام اور شہرت سن رکھی تھی اور خط کے مندرجات سے بھی واضح ہوتا تھا کہ جناب سلیمان علیہ السلام نے سباء کے بارے میں سخت فیصلہ کرلیا ہے۔

لہٰذا وہ گہری سوچ میں پڑ گئی اور چونکہ ملک کے اہم ترین مسائل میں وہ اپنے مصاحبین سے مشورہ کیا کرتی تھی لہٰذا اس بارے میں بھی انہیں اظہار خیال کی دعوت دی اور ان سے مخاطب ہو کر کہا: ''اے سردار و اور بزرگو ایک نہایت ہی باوقار خط میری طرف پھینکا گیا ہے''۔[5]

---

[1] سورہ نمل آیت 24

[2] سورہ نمل آیت 24

[3] سورہ نمل آیت 27

[4] سورہ نمل آیت 28

[5] سورہ نمل آیت 29۔ ملکہ نے یہ کیوں کہا کہ یہ بہت ہی باعظمت خط ہے یا تو اس لئے کہ اس خط کے مطالب بہت ہی گہرے تھے یا پھر اس لئے کہ اس کا آغاز خدا کے نام سے ہوا تھا اور اختتام پر جناب سلیمان علیہ السلام کے صحیح دستخط تھے اور مہر لگی تھی۔ یا اس کا لکھنے والا باعظمت انسان تھا۔ مفسرین نے یہ مختلف احتمالات ذکر کئے ہیں ممکن ہے کہ یہ سب احتمالات جامع مفہوم میں جمع ہوں کیونکہ یہ ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ لوگ سورج پرست تھے لیکن ہم جانتے ہیں کہ بہت سے بت پرست خدا پر بھی ایمان رکھتے تھے اور اسے ''رب الارباب'' کا نام دیتے تھے اور اس کا احترام کرتے تھے اور تعظیم بجالاتے تھے۔

پھر ملکہ سباء نے خط کا مضمون سناتے ہوئے کہا: ''یہ خط سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہے اور اس کے مندرجات یوں ہیں: رحمان ورحیم اللہ کے نام سے''۔ [1]

''میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم میرے مقابلے میں سرکشی سے کام نہ لو اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے میرے پاس آجاؤ''۔ [2]

حضرت سلیمان علیہ السلام کے خط کا تذکرہ کرنے کے بعد اہل دربار کی طرف رخ کر کے ملکہ نے یوں کہا ''اے سردارو! اس اہم معاملے میں تم اپنی رائے کا اظہار کرو، کیونکہ میں کوئی بھی اہم کام تمہاری شرکت اور تمہاری رائے کے بغیر انجام نہیں دیتی ہوں''۔ [3]

اس رائے طلبی سے وہ ان کے درمیان اپنی حیثیت ثابت کرنا چاہتی تھی اور ان کی نظر اور توجہ اپنی طرف مبذول کرنا چاہتی تھی۔ تاکہ اس طرح سے وہ ان کی رائے اور اپنے فیصلے کو ہم آہنگ کر سکے۔

اشراف قوم نے جواب میں کہا: ''ہم بڑی طاقت والے اور جنگجو لوگ ہیں لیکن آخری فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے دیکھئے، آپ کیا حکم دیتی ہیں''؟ [4]

اس طرح سے انھوں نے ایک تو اس کے سامنے اپنی فرمانبرداری کا اظہار کر دیا اور دوسرے اپنی قوت کا ذکر کر کے میدان جنگ میں لڑنے کا مشورہ بھی دے دیا۔

بادشاہ تباہی لاتے ہیں

جب ملکہ نے ان کا جنگ کی طرف رجحان دیکھا اور اندرونی طور پر اس کا قطعاً یہ ارادہ نہیں تھا تو ان کی اس جنگی پیاس کو بجھانے نیز صحیح حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے انہیں قانع کرنے کے لئے کہا ''جب بادشاہ کسی آباد علاقے میں داخل ہوتے ہیں تو انہیں تباہ برباد کر دیتے ہیں اور وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں''۔ [5]

کچھ کو مار ڈالتے ہیں، کچھ کو قیدی بنا لیتے ہیں اور کچھ کو بے گھر کر دیتے ہیں۔ جہاں تک ان کے بس میں ہوتا ہے، لوٹ مار کرتے ہیں۔

پھر اس نے تاکید کے طور پر بلکہ یقینی صورت میں کہا: ''جی ہاں وہ ایسا ہی کرتے ہیں''۔

درحقیقت ملکہ سباء خود بھی ایک ''بادشاہ'' تھی لہٰذا وہ بادشاہوں سے اچھی طرح واقف تھی کہ بادشاہوں کی جنگی حکمت عملی دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہے ایک تباہی اور بربادی اور دوسرے باعزت افراد کو ذلیل کرنا کیونکہ انہیں تو صرف اپنے ہی مفادات عزیز ہوتے ہیں۔ قوم وملت کے مفادات اور ان کی سربلندی سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا لہٰذا عمومی طور پر یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد

---

[1] سورہ نمل آیت 30، 31

[2] سورہ نمل آیت 31، 32

بعید معلوم ہوتا ہے کہ جناب سلیمان علیہ السلام نے اسی عبارت اور انہی عربی الفاظ میں خط لکھا ہو بنابریں ممکن ہے مندرجہ بالا جملے یا تو صرف معنی کو بیان کر رہے ہیں یا پھر سلیمان علیہ السلام کے خط کا خلاصہ ہوں جسے ملکہ سباء نے ان افراد کے سامنے بیان کیا۔

[3] سورہ نمل آیت 32

[4] سورہ نمل آیت 33

[5] سورہ نمل آیت 34

ہوتے ہیں۔

پھر ملکہ نے کہا: ہمیں سب سے پہلے سلیمان علیہ السلام اور اس کے ساتھیوں کو آزمانا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ وہ واقعاً ہیں کیسے لوگ؟ آیا سلیمان علیہ السلام بادشاہ ہے یا پیغمبر ہے؟

تباہ کار ہے یا مصلح، اقوام وملل کو ذلیل کرتا ہے یا عزت بخشتا ہے؟ تو اس کام کے لئے ہمیں تحفے تحائف سے استفادہ کرنا چاہئے لہٰذا ''میں ان کی طرف کچھ معقول تحفے بھیجتی ہوں پھر دیکھوں گی کہ میرے قاصد ان کی طرف سے کیا ردعمل لاتے ہیں''۔[1] بادشاہوں کو تحفے تحائف سے بڑی محبت ہوتی ہے اور یہ تحفے اور ہدیے ہی ان کی بہت بڑی کمزوری ہوتے ہیں۔

انہیں تحفے دے کر جھکایا جاسکتا ہے ہم دیکھیں گے اگر سلیمان علیہ السلام نے ان تحائف کو قبول کرلیا تو معلوم ہوجائے گا کہ وہ بادشاہ ہے اور ہم بھی ڈٹ کر اس کا مقابلہ کریں گے اور اپنی پوری طاقت استعمال کریں گے کیونکہ ہم بہر حال طاقتور ہیں اور اگر اس نے ان تحائف سے بے رخی کی اور اپنی باتوں پر ڈٹا رہا تو ہم سمجھ گے کہ وہ خدا کا نبی ہے تو ایسی صورت میں ہمیں بھی عقل مندی سے کام لینا ہوگا۔

ملکہ سباء نے جناب سلیمان علیہ السلام کے لئے کیا تحائف بھیجے؟ اس بارے میں قرآن نے تو کچھ نہیں بتایا۔ صرف کلمہ ''ہدیہ'' نکرہ کی صورت میں بیان کرکے اس کی عظمت کو ضرور واضح کردیا ہے البتہ مفسرین نے اس بارے میں بہت کچھ کہا ہے جن میں سے بعض باتیں مبالغہ آرائی اور افسانوی رنگ سے خالی نہیں ہیں۔

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ پانچ سو بہترین غلام اور پانچ سو بہترین کنیزیں ان کے لئے بھیجی گئیں غلاموں کو زنانہ لباس میں اور کنیزوں کو مردانہ لباس میں، غلاموں کے کانوں میں گوشوارے اور ہاتھوں میں کنگن اور کنیزوں کے سر پر خوبصورت ٹوپیاں تھیں۔ ملکہ نے اپنے خط میں لکھا کہ اگر آپ اللہ کے نبی ہیں تو غلاموں اور کنیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کردیں۔

انہیں زر و جواہرات اور قیمتی زیورات سے آراستہ کرکے بہترین سواریوں پر سوار کرکے اور جواہرات کی معقول مقدار دے کر جناب سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں بھیجا گیا۔

اور ساتھ ہی ملکہ نے قاصد کو یہ بات بھی سمجھادی کہ تمہارے دربار میں پہنچتے ہی اگر سلیمان علیہ السلام نے تمہیں خشم آلود اور غضب ناک نگاہوں سے دیکھا تو سمجھ لینا کہ یہ بادشاہوں کا انداز ہے اور اگر پیار بھرے انداز میں خندہ پیشانی کے ساتھ تمہیں شرف حضور بخشا تو سمجھ لینا کہ خدا کا نبی ہے۔

مجھے مال کے ذریعہ نہ ورغلاؤ

ملکہ سباء کے روانہ کئے ہوئے افراد نے سرزمین یمن کو خیرباد کہا اور شام اور جناب سلیمان علیہ السلام کے مرکز حکومت کی طرف چل دیئے۔ دل میں یہی تصور لئے ہوئے کہ سلیمان علیہ السلام ان کے تحائف قبول کرلیں گے اور خوش ہوکر انہیں شاباش کہیں گے۔

لیکن جوں ہی وہ سلیمان علیہ السلام کے حضور پیش ہوئے تو وہاں پر عجیب وغریب منظر دیکھا سلیمان علیہ السلام نے نہ صرف ان کا استقبال نہیں کیا بلکہ ان سے یہ بھی کہا ''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ (اپنے) مال کے ذریعے میری مدد کرو؟ حالانکہ یہ مال میری نگاہ میں بالکل بے قیمت سی چیز ہے جو کچھ خدا نے مجھے عطا فرمایا ہے اس سے کئی حصے بہتر اور کہیں قیمتی ہے۔''[2] ''نبوت، علم ودانش، ہدایت اور تقویٰ

---

[1] سورہ نمل آیت 35

[2] سورہ نمل آیت 36

کے مقابلے میں مال کی کیا حیثیت ہے؟ یہ تم ہو جو ایسے تحفے پر خوش ہوتے ہو''۔[1]

جی ہاں یہ تمہیں لوگ ہو کہ اس قسم کے حسین اور قیمتی تحفے اگر ایک دوسرے کے لئے بھی بھیجو تو اس قدر مسرور شاد ماں نظر آتے ہو کہ خوشی کی چمک تمہاری آنکھوں سے نمایاں ہوتی ہے لیکن میری نگاہوں میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

اس طرح سے جناب سلیمان علیہ السلام نے ان کی اقدار اور معیار کی نفی کر دی اور تحائف کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا کر ثابت کر دیا کہ ان کے نزدیک اقدار اور معیار کچھ اور ہیں۔ دنیا پرستوں کے مقرر کردہ معیار ان کے سامنے ہیچ اور بے قیمت ہیں۔

جناب سلیمان علیہ السلام نے حق و باطل کے مسئلے میں اپنے اس عزم بالجزم کو ثابت کرنے کے لئے ملکہ سباء کے خاص ایلچی سے فرمایا: ''تم ان کی طرف واپس پلٹ جاؤ (اور اپنے یہ تحفے بھی ساتھ لے جاؤ) لیکن یہ ضرور یاد رکھو کہ ہم کئی لشکر لے کر ان کے پاس بہت جلد پہنچ رہے ہیں جن کے مقابلے کی طاقت ان میں نہیں ہوگی، اور ہم انہیں اس سرزمین سے ذلیل کر کے نکال دیں گے اور وہ نہایت ہی حقیر ہوں گے۔''[2]

جناب سلیمان علیہ السلام کی یہ دھمکی ان لوگوں کے نزدیک صحیح اور قابل عمل بھی تھی کیونکہ انھوں نے جناب سلیمان علیہ السلام اور ان کے جاہ و جلال اور فوج و لشکر کو نزدیک سے دیکھا تھا۔

چنانچہ جناب سلیمان علیہ السلام نے ان سے دو چیزوں کا تقاضا کیا تھا ایک تو ''برتری طلبی کو ترک کر دیں'' اور دوسرے ''حق کے آگے جھک جائیں''۔

اہل سباء کا ان دونوں چیزوں کا مثبت جواب نہ دینا اور اس کی بجائے تحائف کا بھیجنا اس بات کی دلیل تھا کہ وہ حق کو قبول نہیں کرتے اور نہ ہی برتری طلبی سے باز آتے ہیں لہٰذا سلیمان علیہ السلام نے انہیں پر فوجی دباؤ ڈالنے کی کوشش کی۔

جبکہ ملکہ سباء اور اس کے درباریوں نے دلیل اور ثبوت یا معجزہ وغیرہ کا مطالبہ کیا تھا لہٰذا انہیں موقع فراہم کیا کہ مزید تحقیق کریں لیکن تحفوں کے بھیجنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ انکار کر چکے ہیں۔

یہ بات بھی ہمیں معلوم ہے کہ جناب سلیمان علیہ السلام کو ہدہد نے جو خوشگوار خبر سنائی تھی وہ یہ کہ ملک سباء کے لوگ سورج پرست ہیں اور غیب و حضور کے جاننے والے سے روگردانی کئے ہوئے ہیں اور مخلوق کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اسی بات سے سخت دکھ پہنچا تھا اور ہم جانتے ہیں کہ بت پرستی ایک ایسی بات ہے جسکے سامنے کوئی بھی خدائی دین خاموش تماشائی نہیں بن سکتا اور نہ ہی بت پرستوں کو ایک مذہبی اقلیت مان سکتا ہے بلکہ بوقت ضرورت زبردستی بھی بت کدوں کو مسمار اور شرک و بت پرستی کو نیست و نابود کر سکتا ہے۔

مندرجہ بالا توضیحات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے سلیمان علیہ السلام کی یہ دھمکی ''لا اکراہ فی الدین'' کے بنیادی اصول سے بھی متصادم نہیں ہے کیونکہ بت پرستی کوئی دین نہیں بلکہ ایک خرافات اور راہ حق سے انحراف ہے۔

پلک جھپکتے ہی تخت موجود

آخر کار ملکہ کے کارندے اپنے تحفے تحائف اور ساز و سامان اکٹھا کر کے اپنے ملک واپس چلے گئے اور سارا ماجرا ملکہ اور اس

---

[1] سورہ نمل آیت 36

[2] سورہ نمل آیت 37

کے مصاحبین سے جا کر بیان کیا، اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے ملک کی معجزانہ عظمت بھی بیان کی جن میں سے ہر ایک بات اس امر کی دلیل تھی کہ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہیں اور نہ ہی عام دنیاوی بادشاہ ہیں بلکہ خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور ان کی حکومت ایک خدائی حکومت ہے۔

یہاں پر ان کے لئے یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ نہ صرف جناب سلیمان علیہ السلام کے ساتھ فوجی مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے بلکہ اگر بالفرض مقابلہ کریں بھی تو قوی احتمال یہی ہے کہ ان کا خدا کے ایک زبردست طاقتور نبی سے مقابلہ ہوگا۔

لہٰذا ملکہ سبا نے اپنی قوم کے بہت سے سرداروں کے ساتھ مشورے کے بعد فیصلہ کیا کہ سلیمان علیہ السلام کے پاس ذاتی طور پر جا کر اس اہم مسئلے کے بارے میں تحقیقات کریں تا کہ پتہ چل سکے کہ سلیمان علیہ السلام کا کیا مسلک ہے؟

کسی بھی صورت میں یہ خبر حضرت سلیمان علیہ السلام تک بھی پہنچ گئی لہٰذا انھوں نے فیصلہ کیا کہ اب جبکہ ملکہ اور اس کے ساتھی راستے میں ہیں انہیں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہئے، تا کہ انہیں پہلے سے زیادہ ان کے اعجاز کی حقیقت کا علم ہو جائے اور وہ ان کی دعوت قبول کر لیں۔

لہٰذا حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے درباریوں سے مخاطب ہو کر کہا ''اے بزرگو تم میں سے کون شخص اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ اس کا تخت میرے پاس لے آئے قبل اس کے کہ وہ خود میرے پاس آئیں اور سر تسلیم خم کریں۔''[1]

اس موقع پر دو قسم کے افراد نے کہا کہ ہم یہ کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔ جن میں سے ایک عجیب اور دوسرا عجیب تر تھا، سب سے پہلے جنوں میں سے ایک عفریت نے ان کی طرف منہ کر کے کہا: ''میں اس کا تخت آپؑ کی مجلس سے اٹھنے سے پہلے پہلے آپؑ کے پاس لا دوں گا۔''[2]

دوسرا ایک صالح اور متقی انسان تھا اور ''کتاب خدا'' سے بھی اسے اچھی خاصی واقفیت تھی۔ جیسا کہ اس شخص کے بارے میں خود قرآن کہتا ہے: ''جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا اس نے کہا میں آپؑ کے پلک جھپکنے سے بھی پہلے اس تخت کو لے آؤں گا''۔[3]

جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی پیش کش قبول کر لی تو اس نے بھی اپنی معنوی طاقت کے ذریعے ملکہ سبا کا تخت پلک جھپکنے میں آپؑ کے پاس حاضر کر دیا اور جب سلیمان علیہ السلام نے اسے اپنے پاس موجود پایا تو خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہنے لگے: ''یہ میرے پروردگار کا فضل ہے، تا کہ مجھے آزمائے کہ میں اس کا شکر بجالاتا ہوں یا کفران نعمت کرتا ہوں''۔[4]

آصف بن برخیا

یہ شخص کون تھا، اسے یہ عجیب وغریب طاقت کہاں سے ملی اور علم الکتاب سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے

---

[1] سورہ نمل آیت 38

[2] سورہ نمل آیت 39

''عفریت'' کا معنی ہے مغرور، سرکش اور خبیث۔ اور ''میں ان کی نسبت طاقتور اور امین ہوں'' جملے کی کئی بار تاکید کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عفریت میں کئی لحاظ سے خیانت کا اندیشہ تھا لہٰذا اسے اپنا دفاع کرنا پڑا اور امانت و وفاداری کا یقین دلانا پڑا۔

صورت حال خواہ کچھ ہو جناب سلیمان علیہ السلام کی زندگی عجائبات اور معجزات سے بھری پڑی ہے اور کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے کہ ایک عفریت اس قسم کا کارنامہ ایک یا چند گھنٹوں میں انجام دے یعنی جتنی دیر سلیمان علیہ السلام لوگوں میں فیصلے کے لئے یا امور مملکت میں غور وفکر کے لئے یا عوام کو نصیحت کے لئے بیٹھے ہیں اتنی دیر میں وہ بھی ملکہ سبا کا تخت لا کر حاضر کر دیتا۔

[3] سورہ نمل آیت 40

[4] سورہ نمل آیت 40

مختلف اقوال ہیں لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ شخص جناب سلیمان علیہ السلام کے مومن اور قریبی رشتہ داروں اور خاص دوستوں میں سے تھا۔

تواریخ میں اسکا نام ''آصف بن برخیا'' لکھا ہے۔ وہ جناب سلیمان علیہ السلام کے وزیر اور بھانجے تھے۔

اور ''علم کتاب'' سے ان کی آسمانی کتابوں سے واقفیت مراد ہے ایسی عمیق اور گہری واقفیت جس سے ان کے لئے ممکن ہو گیا کہ وہ اس طرح کا معجزانہ کارنامہ انجام دیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد لوح محفوظ ہے۔

یعنی علم الٰہی کی لوح اور اس کے صرف ایک گوشے کا اس بندۂ خدا کو علم حاصل تھا جس کی وجہ سے وہ ملکہ کے تخت کو ''سباء'' سے آنکھ جھپکنے کی دیر میں لانے پر قادر تھا۔

بہت سے مفسرین اور غیر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ مرد مومن اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم سے باخبر تھا۔ یعنی ایسا باعظمت اور بزرگ نام جس کے سامنے دنیا کی ہر چیز سر جھکائے ہوئے ہے اور وہ انسان کو بے حد و اندازہ قدرت عطا کرتا ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسم اعظم سے مراد یہ ہے کہ کسی خاص کلمہ کے زبان سے نکال دینے سے اس کے اس قدر عجیب و غریب اثرات ظاہر ہو جاتے ہیں۔

ایسی بات نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اس نام اور اس کی صفات کو اپنانا ہوتا ہے اور دل و جان سے اس پر عمل کرنا ہوتا ہے اور علم، اخلاق تقویٰ اور ایمان کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہو کر خود کو اس کا مظہر بنانا ہوتا ہے تب کہیں جا کر اس اسم اعظم کے پرتو میں انسان کے اندر معجزانہ امور کی انجام دہی کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ''عفریت جن'' میں ایسے خارق العادۃ کام انجام دینے کی طاقت کیونکر ہو سکتی ہے؟

اس کا جواب تو ہم اعجاز سے متعلق بحث میں دے چکے ہیں۔

غیر مومن لوگ بھی زبردست ریاضتوں اور مشقتوں کی وجہ سے کچھ ایسے امور کی انجام دہی پر قادر ہو جاتے ہیں۔

جو عموماً خلاف معمول ہوتے ہیں۔

لیکن ان کے کاموں میں اور معجزات میں فرق ہوتا ہے کیونکہ ان کے اس قسم کے کام محدود بشری طاقت کے مرہون منت ہوتے ہیں۔

جبکہ معجزات کا دارومدار خداوند عالم کی بے پایاں اور لایزال قدرت پر ہوتا ہے جو خود خدا کی دوسری صفات کی مانند غیر محدود ہوتی ہے۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ عفریت جن اپنی توانائی کو ملکہ سبا کے تخت کو لانے کے لئے جناب سلیمان علیہ السلام کی مجلس برخاست کرنے میں محدود کرتا ہے جبکہ جناب آصف بن برخیا نے اپنی توانائی کو کسی حد میں محدود نہیں کیا اگر وہ پلک جھپکنے کی بات بھی کرتے ہیں تو در حقیقت ایک کم از کم مدت کی طرف اشارہ ہے جس سے کم مدت اور کوئی ہو نہیں سکتی۔

اور مسلم ہے کہ جناب سلیمان علیہ السلام بھی اس قسم کے کاموں میں صالح شخص کی حمایت کریں گے کیونکہ اس طرح سے اس کا تعارف ہوگا اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں گے نہ کہ ایک عفریت کی کہ جس کی وجہ سے کوتاہ نظر لوگ شک میں پڑ جائیں اور اسے اس کی پاکیزگی اور اچھائی کی دلیل سمجھنے لگ جائیں۔

ملکہ سبا کے دل میں نور ایمان

قرآن میں سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا کی سبق آموز داستان سے متعلق ایک اور پہلو پیش کیا گیا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کی عقل وخرد کو آزمانے اور خدا پر اس کے ایمان لانے کے لئے راہ ہموار کرنے کی غرض سے اس کے تخت میں کچھ تبدیلی کرنے کا حکم دیا۔ تاکہ وہ پہچانا نہ جاسکے چنانچہ انھوں نے کہا: اس کے تخت میں کچھ تبدیلی کردو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سمجھ پاتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جو ہدایت نہیں پاتے''۔ [1]

اگر چہ ملکہ کے تخت کا سبا سے شام میں آجانا ہی اس بات کے لئے کافی تھا کہ وہ اسے آسانی کے ساتھ نہ پہچان سکے لیکن اس کے باوجود جناب سلیمان علیہ السلام سے حکم دیا کہ اس میں کچھ تبدیلیاں بھی کردی جائیں۔ ممکن ہے کہ یہ تبدیلیاں بعض علامتوں اور جواہر کو ادھر ادھر کرکے کی گئی ہوں یا بعض رنگوں کو تبدیل کردیا گیا ہو۔ [2]

صورت حال خواہ کچھ بھی ہو اب ملکہ پہنچی تو کسی نے (تخت کی طرف اشارہ کرکے) کہا: ''کیا آپ کا تخت اسی طرح کا ہے''۔ [3]

ملکہ سبا نے نہایت ہی زیرکانہ انداز میں ایک بہت ہی شستہ اور جچا تلا جواب دیتے ہوئے کہا: ''یہ تو خود وہی تخت معلوم ہوتا ہے''۔ [4]

اگر وہ کہتی کہ اس جیسا ہے تو جواب صحیح نہ ہوتا اور اگر کہتی کہ بالکل وہی ہے تو خلاف احتیاط بات تھی۔ کیونکہ اس قدر لمبے فاصلوں سے اس کے تخت کا سرزمین سلیمان علیہ السلام میں آنا عام حالات میں ممکن نہیں تھا۔ اس کی صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے اور وہ ہے معجزہ۔

اس کے علاوہ تاریخ میں ہے کہ ملکہ نے اپنے اس گراں قیمت تخت کی بڑی حفاظت کی تھی اسے اپنے خصوصی محل کے خاص کمرے میں اہم مقام پر نصب کیا ہوا تھا جس کی حفاظت کے لئے خصوصی دستہ مقرر تھا اور اس محل میں نہایت مضبوط دروازے لگے ہوئے تھے۔

لیکن ان تمام تبدیلوں کے باوجود ملکہ نے اپنے تخت کو پہچان لیا تھا۔

اس نے فوراً کہا: ''ہم تو اسے پہلے ہی جان چکے تھے اور سر تسلیم خم کرچکے تھے''۔

گویا وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ ان سارے کاموں سے سلیمان علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ ہم اس کے معجزے پر ایمان لے آئیں لیکن ہم تو اس سے پہلے دوسری علامتوں کی وجہ سے ان کی حقانیت کے معترف ہوچکے ہیں اور ان غیر معمولی چیزوں کو دیکھنے سے پہلے ہی ان پر ایمان لاچکے ہیں اس طرح کے کاموں کی اب چنداں ضرورت نہیں تھی۔

---

[1] سورہ نمل آیت 41

[2] لیکن یہاں پر جو سوال درپیش ہے وہ یہ ہے کہ آخر جناب سلیمان علیہ السلام، اس کی عقل وخرد اور فہم وذکا کو کیوں آزمانا چاہتے تھے؟
ہوسکتا ہے اس لئے تاکہ وہ یہ جان سکیں کہ اس کے ساتھ کس انداز میں پیش آنا چاہئے۔ لہٰذا وہ اس طرح سے اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت کو جاننا چاہتے ہوں۔

[3] سورہ نمل آیت 42

[4] سورہ نمل آیت 42

تو اس طرح سے (سلیمان نے) اسے ہر غیر خدا کی عبادت سے روک دیا۔

ہر چند کہ وہ اس سے پہلے کافروں میں سے تھی۔

تو اس نے یہ واضح اور روشن علامات دیکھ کر اپنے تاریک ماضی کو الوداع کہا اور اپنی زندگی کے نئے مرحلے میں قدم رکھا، جو نور ایمان و یقین سے بھرپور تھا۔

ملکہ سبا حضرت سلیمان علیہ السلام کے محل میں

اس سلسلہ کے آخر میں اس داستان کا ایک اور منظر پیش کیا گیا ہے اور وہ ہے ملکہ سباء کا حضرت سلیمان کے محل میں داخل ہونا حضرت سلیمان نے حکم دے دیا تھا کہ ان کے ایک محل کے صحن کو بلور سے تیار کیا جائے اور اس کے نیچے پانی چلا دیا جائے۔

''تو جب ملکہ سباء وہاں پہنچی تو اس سے کہا گیا کہ محل کے صحن میں داخل ہو جاؤ''۔[1]

ملکہ نے جب صحن کو دیکھا تو اس نے سمجھا کہ پانی کی نہر چل رہی ہے اس نے پنڈلی سے کپڑا اٹھایا تا کہ پانی کو عبور کرے (اور وہ تعجب میں غرق تھی کہ پانی کی نہر کا یہاں کیا کام؟)

''لیکن سلیمان نے اس سے کہا محل کا صحن صاف و شفاف بلور سے بنا ہوا ہے''۔[2]

(یہ پانی نہیں ہے کہ جسے عبور کرنے کے لئے تم نے پائنچے اٹھا رکھے ہیں)۔[3]

''یہی وجہ ہے کہ جب ملکہ سبا نے ان مناظر کو دیکھا تو فوراً کہا: پروردگارا:''میں نے تو اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اب میں سلیمان کے ساتھ مل کر اس اللہ کی بارگاہ میں سر تسلیم خم کر چکی ہوں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے''۔[4]

---

[1] سورہ نمل آیت 44

[2] سورہ نمل آیت 44

[3] اس مقام پر ایک نہایت ہی اہم سوال پیش آتا ہے اور وہ یہ کہ جناب سلیمان اللہ کے ایک عظیم پیغمبر تھے وہ اس قدر آرائشی اور زیبائشی کاموں میں کیوں لگ گئے؟ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ایک بادشاہ اور فرمانروا تھے لیکن دوسرے انبیاء کی طرح کیا وہ سادگی کو اختیار نہیں کر سکتے تھے؟

جواباً عرض ہے کہ اگر حضرت سلیمان نے ملکہ سبا کو مسلمان بنانے کے لئے اس طرح کی آرائش و زیبائش سے کام لیا ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟ خصوصاً جبکہ ملکہ اپنی تمام طاقت و عظمت، خوبصورت تاج و تخت، باشکوہ محل و قصر اور زرق و برق آرائش و زیبائش میں ہی سمجھتی تھی چنانچہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے اپنی سلطنت کی ایک جھلک دکھائی تو ملکہ کی آنکھوں کے سامنے اپنی حکومت کی تمام سج دھج ماند پڑ گئی اور یہی بات اس کی زندگی کا اہم موڑ ثابت ہوئی جس میں اسے اقدار اور معیار زندگی کے بارے میں تبدیلی کرنا پڑی۔

آخر اس بات میں کیا حرج ہے کہ انھوں نے نقصان دہ اور خونریز لشکر کشی کی بجائے ایسی حکمت عملی اختیار کی ملکہ کا دماغ چکرانے لگا وہ اس قدر مبہوت ہو گئی کہ جنگ کا تصور ہی اس کے دماغ سے کافور ہو گیا خصوصاً جبکہ وہ ایک عورت تھی اور عورت کی سب سے بڑی کمزوری اس قسم کے تکلفات ہوتے ہیں کیونکہ عورت ایسے تکلفات کو بہت اہمیت دیتی ہے۔

بہت سے مفسرین نے اس بات کی تصریح بھی کی ہے ملکہ سباء کے سرزمین شام میں قدم رکھنے سے پہلے حضرت سلیمان نے حکم جاری کر دیا تھا کہ اس قسم کا ایک عظیم محل تیار کیا جائے جس سے ان کا مقصد ملکہ کو مطیع کرنے کے لئے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا تھا اور اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ظاہری طاقت کے لحاظ سے بھی عظیم جناب سلیمان کے پاس ایک بڑی طاقت ہے جس کے ذریعے انھوں نے ایسا کام انجام دیا ہے۔

''دوسرے لفظوں میں ایک وسیع و عریض علاقے کا امن و امان، دین حق کی قبولیت اور بے پناہ جنگی اخراجات سے بچنے کے لئے اس قسم کے اخراجات کوئی بات نہیں تھے۔''

[4] سورہ نمل آیت 44

میں پہلے سورج کی پوجا کیا کرتی تھی، زیب وزینت میں کھو چکی تھی اور خود کو دنیا کا سب سے بہتر اور برتر انسان سمجھتی تھی۔
لیکن اب پتہ چلا ہے کہ میری طاقت کتنی کمزور اور حقیر تھی بلکہ اصولی طور پر یہ زر و جواہر اور قیمتی زیورات انسانی روح کو کبھی سیراب نہیں کر سکتے۔''

پروردگارا میں اپنے رہبر سلیمان کے ساتھ مل کر تیری بارگاہ میں حاضر ہوں اور اپنے کئے پر نادم ہوں اور تیرے آستان قدسی پر میں نے اپنا سر جھکا دیا ہے۔

ملکہ سبا کا انجام

ملکہ سبا کے بارے میں جو کچھ قرآن مجید نے بیان کیا ہے وہی ہے جو ہم نے ابھی پڑھا ہے آخر کار وہ ایمان لے آئی اور صالحین کے کارواں میں شامل ہوگئی اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ ایمان اختیار کرنے کے بعد اپنے ملک کو واپس لوٹ گئی اور سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ملک پر حکمراں رہی یا سلیمان علیہ السلام کے پاس رہ گئی اور انہی کے ساتھ شادی کر لی یا سلیمان کے مشورہ پر یمن کے کسی بادشاہ جسے ''تبع'' کہا جاتا تھا، اس کے ساتھ عقد کر لیا اس بارے میں قرآن نے کچھ نہیں بتایا۔

چونکہ قرآن کا ہدف اصلی تربیتی مسائل بیان کرنا ہے اور یہ بات ان مسائل سے غیر متعلق تھی لہٰذا اسے بیان کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی لیکن مفسرین اور مؤرخین نے اس کے بارے میں مختلف راستے اختیار کئے ہیں جنکی تحقیق کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اگر چہ بعض مفسرین کے بقول مشہور و معروف یہی ہے کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئی۔

البتہ اس مقام پر اس نکتے کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جناب سلیمان علیہ السلام اور ان کے لشکر و حکومت کے بارے میں نیز ملکہ سباء اور اس کی تفصیلی زندگی کے بارے میں بہت ہی افسانہ طرازی کی گئی ہے کہ بعض مواقع پر تو عوام الناس کے لئے حق و باطل میں تمیز کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور بعض موقعوں پر اس صحیح تاریخی واقعے پر ایسے تاریک پردے ڈال دیئے جاتے ہیں کہ اس کی اصلیت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور یہ سب کچھ ان خرافات کا غلط نتیجہ ہوتا ہے جو حقائق کے ساتھ ملا دیئے جاتے ہیں لہٰذا ایسے خرافات سے پوری طرح چوکنا رہنا چاہئے۔

عبرت انگیز موت

قرآن ایک مقام پر خدا کے اس عظیم پیغمبر کی عجیب و غریب اور عبرت انگیز موت کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے اور اس حقیقت کو روشن کر رہا ہے کہ اتنے باعظمت پیغمبر اور اتنی قدرت، رعب اور دبدبہ رکھنے والے حکمران نے اپنی جان کس طرح آسانی کے ساتھ جان آفرین کے سپرد کر دی۔ یہاں تک کہ بستر پر لیٹنے سے پہلے ہی موت کے چنگل نے ان کے گریبان کو پکڑ لیا۔ فرماتا ہے: ''جب ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے موت کا حکم نافذ کر دیا تو کسی نے بھی لوگوں کو اس کی موت سے آگاہ نہ کیا مگر زمین پر رینگنے والے نے کہ جس نے اس کے عصاء کو کھا لیا یہاں تک کہ اس کا عصا ٹوٹ گیا اور سلیمان علیہ السلام کا پیکر نیچے گر پڑا''۔[1]

جب سلیمان علیہ السلام کی موت کا وقت آن پہنچا تو وہ اس وقت کھڑے ہوئے تھے اور اپنے عصا پر تکیہ کئے ہوئے تھے کہ اچانک موت نے ان کو آ پکڑا، اور ان کی روح بدن سے پرواز کر گئی اور وہ ایک مدت تک اسی حالت میں کھڑے رہے یہاں تک کہ

---

[1] سورہ سباء آیت 14

دیمک نے کہ قرآن جسے ''دابۃ الارض'' (زمین پر رینگنے والی چیز) سے تعبیر کرتا ہے، ان کے عصا کو کھالیا، جس سے ان کا اعتدال برقرار نہ رہ سکا اور زمین پر گر پڑے تب لوگ ان کی موت سے آگاہ ہوئے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ اس دن سلیمان علیہ السلام نے دیکھا کہ ایک خوبصورت اور خوش پوش جوان قصر کے ایک کونے سے باہر آیا اور ان کی طرف بڑھا، سلیمان علیہ السلام نے تعجب کیا، کہا: تو کون ہے؟ اور کس کی اجازت سے یہاں آیا ہے؟ میں نے تو یہ حکم دیا ہوا تھا کہ آج کوئی شخص یہاں نہ آنے پائے۔

اس نے جواب دیا: میں وہ ہوں کہ نہ بادشاہوں سے ڈرتا ہوں اور نہ کسی سے رشوت لیتا، ہوں سلیمان علیہ السلام نے بہت ہی تعجب کیا۔ لیکن اس نے مہلت نہ دی اور کہا میں موت کا فرشتہ ہوں، میں اس لئے آیا ہوں تا کہ میں آپؑ کی روح قبض کروں یہ کہتے ہی فوراً ان کی روح قبض کر لی۔ [1]

سلیمان علیہ السلام کی موت ایک مدت تک کیوں پوشیدہ رہی؟

یہ بات کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت ان کے کارکنان حکومت پر کتنی مدت تک مخفی رہی صحیح طور پر واضح نہیں ہے، ایک سال؟ ایک ماہ؟ یا چند روز؟

مفسرین کا اس سلسلہ میں ایک نظریہ نہیں ہے۔

کیا یہ اخفا اور کتمان ان کے اصحاب اور ارکان سلطنت کی جانب سے صورت پذیر ہوا تھا؟ کیا انہوں نے جانتے بوجھتے اس غرض سے کہ کہیں امور سلطنت کا رشتہ وقتی طور پر بکھر نہ جائے، ان کی موت کو پوشیدہ رکھا؟

یا یہ کہ اصحاب وارکان سلطنت بھی اس امر سے آگاہی نہیں رکھتے تھے۔

یہ بات بہت ہی بعید نظر آتی ہے کہ ایک طولانی مدت تک، یہاں تک کہ ایک دن سے زیادہ ہی سہی، ان کے اطراقیان، (گردوپیش رہنے والے اصحاب وارکان سلطنت) بھی آگاہ نہ ہوں، کیونکہ یہ بات تو مسلم ہے، کہ کچھ لوگ ان کا کھانا لے جانے پر مامور تھے اور ان تک دوسری ضروریات پہنچاتے تھے، وہ تو اس واقعہ سے ضرور آگاہ ہو جاتے، اس بنا پر بعید نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے۔

کہ وہ اس امر سے آگاہ تھے، لیکن اسے کچھ مصلحتوں کی بنا پر مخفی رکھا، اسی لئے بعض روایات میں آیا ہے کہ اس مدت میں ''آصف بن برخیا'' ان کے وزیر خاص ملک کے امور کی تدبیر کرتے اور نظم ونسق چلاتے رہے۔

کیا سلیمان علیہ السلام کھڑے ہوئے عصا کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھے یا بیٹھے ہوئے اپنے ہاتھ عصا پر رکھے ہوئے تھے، اور سر کو ہاتھوں پر ٹکائے ہوئے تھے اور اسی حالت میں ان کی روح قبض ہوگئی اور وہ ایک مدت تک اسی طرح رہے؟ اس سلسلے میں مختلف احتمالات ہیں، اگر چہ آخری احتمال زیادہ نزدیک نظر آتا ہے۔

اگر یہ مدت طولانی تھی تو کیا غذا کا نہ کھانا اور پانی کا نہ پینا دیکھنے والوں کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتا تھا۔

چونکہ سلیمان علیہ السلام کے تمام کام عجیب وغریب تھے لہٰذا وہ شاید اس مسئلہ کو بھی عجیب وغریب شمار کرتے تھے، یہاں تک کہ

---

[1] اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ بہت سے انبیاء کی داستانوں کی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کی داستان میں بھی افسوسناک حد تک گھڑی ہوئی روایات شامل کر دی گئی ہیں، اور ان کے ساتھ بہت سی خرافات منسوب کر دی گئی ہیں، کہ جنہوں نے اس عظیم پیغمبر کے چہرے کو بدل دیا ہے، اور ان خرافات کا زیادہ تر حصہ موجودہ توریت سے لیا گیا ہے، اور اگر ہم صرف اسی پر قناعت کر لیں کہ جو قرآن نے کہا ہے، تو پھر کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

ایک روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آہستہ آہستہ ایک گروہ کے درمیان زمزمہ پیدا ہوا کہ سلیمان علیہ السلام کی پرستش کرنا چاہئے یا ایسا نہیں ہے کہ وہ ایک عرصہ سے ایک ہی جگہ پر ثابت و برقرار ہے؟ نہ تو وہ سوتا ہے، نہ کھانا کھاتا ہے اور نہ پانی پیتا ہے۔

لیکن جس وقت عصا ٹوٹا اور سلیمان علیہ السلام نیچے گرے، تو یہ تمام رشتے ایک دوسرے سے ٹوٹ گئے اور ان کے خیالات نقش برآب ہو گئے۔

حضرت ایوب علیہ السلام

حضرت ایوب علیہ السلام کی حیران کن زندگی اور ان کا صبر

گفتگو حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ جو صبر و استقامت کا نمونہ تھے، ان کا ذکر اس لئے ہے تا کہ اس وقت کے اور پھر آج کے اور آئندہ کے مسلمانوں کے لئے مشکلوں اور پریشانیوں میں استقامت، قیام اور جدوجہد کا درس ہو اور انہیں پامردی کی دعوت دی جائے اور اس صبر و استقامت کا حسن انجام واضح کیا جائے۔

حضرت ایوب علیہ السلام وہ تیسرے نبی ہیں کہ ہمارے عظیم نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فرض کیا گیا ہے کہ ان کے واقعہ کو مسلمان کے لئے بیان کریں تا کہ مسلمان بڑی بڑی مشکلات سے نہ گھبرائیں اور اس کی رحمت سے کبھی بھی مایوس نہ ہوں۔ [1]

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: ''ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو کہ جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا اور عرض کی: شیطان نے مجھے بہت تکلیف اور اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے''۔ [2]

اس گفتگو میں قرآن:

اولاً: بارگاہ الٰہی میں حضرت ایوب علیہ السلام کا بلند مقام ''عبدنا'' (ہمارا بندہ) سے معلوم ہوتا ہے۔

ثانیاً: اشارتاً حضرت ایوب علیہ السلام کی شدید اور طاقت فرسا تکلیف اور فراواں مصیبت کا ذکر ہے، اس ماجرے کی تفصیل قرآن میں نہیں آئندہ لیکن حدیث و تفسیر کی مشہور کتب میں اس کی تفصیل نقل ہوئی ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کیوں مشکلات میں گرفتار ہوئے

کسی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا: وہ مصیبت جو حضرت ایوب علیہ السلام کو دامن گیر ہوئی، کس بنا پر تھی؟ (شاید سائل کا خیال تھا کہ ان سے کوئی غلط کام سرزد ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اللہ نے انہیں مصیبت میں مبتلا کر دیا)۔

امام علیہ السلام نے اس سوال کا تفصیلی جواب دیا جس کا خلاصہ یوں ہے: ایوب علیہ السلام کفران نعمت کی وجہ سے ان عظیم مصائب میں گرفتار نہیں ہوئے بلکہ اس کے برعکس شکر نعمت کی وجہ سے ہوئے، کیونکہ شیطان نے بارگاہ خدا میں عرض کی کہ یہ جو ایوب تیرا شکر گزار ہے وہ فراواں نعمتوں کی وجہ سے ہے کہ جو تو نے اسے دی ہیں، اگر یہ نعمتیں اس سے چھین لی جائیں تو یقیناً وہ کبھی شکر گزار بندہ نہیں ہوگا۔

اس بنا پر کہ ساری دنیا پر ایوب علیہ السلام کا خلوص واضح ہو جائے اور انہیں عالمین کے لئے نمونہ قرار دیا جائے تا کہ لوگ نعمت اور مصیبت ہر دو عالم میں شاکر و صابر رہیں۔ اللہ نے شیطان کو اجازت دی کہ وہ حضرت ایوب علیہ السلام کی دنیا پر قبضہ کر لے، شیطان نے اللہ

---

[1] برخلاف موجودہ توریت کے کہ جو انہیں انبیاء کے زمرے میں شمار نہیں کرتی بلکہ انہیں ایک نیک اور صالح انسان سمجھتی ہے کہ جن کی بہت سی اولاد تھی اور جو صاحب مال شخص تھے۔

[2] سورہ انبیاء آیت 41

سے خواہش کی ایوب کا فراواں مال و دولت، ان کی کھیتیاں، بھیڑ بکریاں اور ال اولاد سب ختم ہو جائے۔ آفتیں اور مصیبتیں آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا لیکن نہ صرف یہ کہ ایوب علیہ السلام کے شکر میں کمی نہیں آئی بلکہ اس میں اور اضافہ ہو گیا۔ خدا سے شیطان نے خواہش کی کہ اب اسے ایوب علیہ السلام کے بدن پر بھی مسلط کر دے اور وہ اس طرح بیمار ہو جائیں کہ ان کا بدن شدت درد کی لپیٹ میں آ جائے اور وہ بیماری کے بستر کا اسیر ہو جائے لیکن اس چیز نے بھی ان کے مقام شکر میں کمی نہ کی۔

پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس نے ایوب علیہ السلام کا دل توڑ دیا اور ان کی روح کو سخت مجروح کیا، وہ یہ کہ نبی اسرائیل کے راہبوں کی ایک جماعت انہیں دیکھنے آئی اور انھوں نے کہا کہ تو نے کون سا گناہ کیا ہے جس کی وجہ سے اس دردناک عذاب میں مبتلا ہے؟ ایوب علیہ السلام نے جواباً کہا: میرے پروردگار کی قسم کہ مجھ سے کوئی غلط کام نہیں ہوا میں ہمیشہ اللہ کی اطاعت میں کوشاں رہا ہوں اور میں نے جب بھی کوئی لقمہ غذا کا کھایا ہے کوئی نہ کوئی یتیم و بے نوا میرے دستر خوان پر ہوتا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ ایوب علیہ السلام دوستوں کی اس دل آزاری پر ہر دوسری مصیبت سے زیادہ دکھی ہوئے پھر بھی صبر کا دامن نہ چھوڑا اور شکر کے صاف و شریں پانی کو کفران سے الودہ نہ کیا، صرف بارگاہ خدا کی طرف رخ کیا اور مذکورہ جملہ عرض کیا اور چونکہ آپ اللہ کے امتحانوں سے خوب عہدہ برا ہوئے لہٰذا اللہ نے اپنے اس شاکر و صابر بندے پر پھر اپنی رحمت کے دروازے کھول دیئے اور کھوئی ہوئی نعمتیں یکے بعد دیگرے پہلے سے بھی زیادہ انہیں عطا کیں تا کہ سب لوگ صبر و شکر کا نیک انجام دیکھ لیں۔

بہر حال کہتے ہیں کہ ان کی بیماری اور ناراحتی سات سال تک رہی اور ایک روایت کے مطابق سترہ برس تک رہی، یہاں تک کہ آپ کے نزدیک ترین ساتھی بھی ساتھ چھوڑ گئے، صرف ایک بیوی نے وفا میں استقامت کی اور یہ چیز خود ایک شاہد ہے بعض بیویوں کی وفاداری پر۔

سب سے بڑا غم دشمنوں کی دلآزاری باتیں

لیکن حضرت ایوب علیہ السلام کو جس چیز سے زیادہ دکھ ہوتا تھا وہ دشمنوں کی دل آزاری تھی، اسی لئے ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت ایوب علیہ السلام کو کھوئی ہوئی صحت و سلامتی پھر مل گئی اور رحمت الٰہی کے دروازے ان کے لئے کھل گئے تو لوگوں نے آپ سے سوال کیا کہ سب سے شدید درد آپ کو کون سا تھا؟ تو آپ نے کہا: دشمنوں کی شماتت۔

آخر کار حضرت ایوب علیہ السلام ازمائش الٰہی کی اس گرم بھٹی سے صحیح و سالم باہر نکل آئے اور پھر رحمت خدا کا آغاز ہوا، انہیں حکم دیا گیا کہ ''اپنا پاؤں زمین پر مارو'' تو پانی کا چشمہ ابل پڑے گا کہ جو تیرے نہانے کے لئے ٹھنڈا بھی ہوگا اور تیرے پینے کے لئے عمدہ بھی۔[1]

وہی خدا جس نے خشک اور تپتے بیابان میں شیر خوار اسماعیل کی ایڑیوں کے نیچے چشمہ پیدا کر دیا، وہی خدا کہ ہر حرکت و سکون اور ہر نعمت و عنایت جس کی طرف سے ہے، اس نے یہ فرمان ایوب علیہ السلام کے لئے بھی صادر فرمایا، پانی کا چشمہ ابلنے لگا، ٹھنڈا اور میٹھا چشمہ جو اندرونی و بیرونی سب بیماریوں کے لئے شفا بخش تھا۔

بعض کا خیال ہے کہ اس چشمے میں ایک طرح کا معدنی پانی تھا جو پینے کے لئے بھی اچھا تھا اور بیماریوں کو دور کرنے کے لئے بھی مؤثر تھا، بہر حال کچھ بھی تھا ایک صابر و شاکر بندی کے لئے اللہ کا لطف و کرم تھا۔

---

[1] سورہ ص آیت 42

پہلی اور اہم ترین خدائی نعمت صحت تھی، جب وہ ایوب علیہ السلام کی طرف لوٹ آئی تو دوسری نعمتوں کے لوٹنے کی نوبت آئی، اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے: ''ہم نے اسے اس کے گھر والے بخش دیئے۔ اور ان کے ساتھ ان کے مانند بھی قرار دیئے۔ تاکہ ہماری طرف سے رحمت ہو اور صاحبان فکر و نظر کے لئے نصیحت بھی''۔ [1]

ان کا گھرانہ ان کے پاس واپس آیا، اس سلسلے میں مختلف تفسیریں موجود ہیں، مشہور یہ ہے کہ وہ مر چکے تھے اور اللہ نے انہیں پھر زندگی دی۔

لیکن بعض نے لکھا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی طویل بیماری کے باعث وہ ادھر ادھر بکھر چکے تھے جب حضرت ایوب علیہ السلام صحت یاب ہو گئے تو وہ پھر آپ کے گرد اگرد جمع ہو گئے۔

کچھ لوگوں نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ وہ سب یا ان میں سے بعض افراد بھی طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے تھے رحمت الٰہی ان کے شامل حال ہوئی وہ سب روبصحت ہوئے اور پروانوں کی طرح وجود پدر کی شمع کے گرد جمع ہوئے۔

''اور ان کے ساتھ ان کے مانند بھی قرار دیئے'' یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے ان کے گھر کو پہلے سے بھی زیادہ آباد اور پررونق کیا اور ایوب علیہ السلام کو مزید بیٹے عطا کئے۔

قرآن میں اگرچہ حضرت ایوب علیہ السلام کے مال و دولت کے بارے میں بات نہیں کی گئی لیکن موجود قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے پھر آپ کو مال و دولت بھی فراواں تر عطا فرمایا۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی قسم

اب صرف ایک مشکل ایوب علیہ السلام کے لئے باقی تھی، وہ قسم جو انھوں نے اپنی بیوی کے بارے میں کھائی تھی اور وہ یہ تھی کہ انھوں نے ان سے کوئی خلاف مرضی کام دیکھا تھا لہٰذا انھوں نے اس بیماری کی حالت میں قسم کھائی کہ جس وقت ان میں طاقت پیدا ہو گئی تو وہ اسے ایک سو یا اس سے کچھ کم کوڑے ماریں گے، لیکن صحت یابی کے بعد وہ چاہتے تھے۔

کہ اس کی خدمات اور وفاداریوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اسے معاف کر دیں لیکن قسم اور خدا کے نام کا مسئلہ درمیان میں تھا۔

خدا نے یہ مشکل بھی ان کے لئے حل کر دی، جیسا کہ قرآن کہتا ہے کہ ان سے فرمایا گیا: ''گندم کی شاخوں (یا اسی قسم کی کسی چیز) کی ایک مٹھی بھر لو اور اس کے ساتھ مارو اور اپنی قسم نہ توڑو''۔ [2]

حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی کا نام ایک روایت کے مطابق ''لیا'' بنت یعقوب تھا، اس بارے میں کہ اس سے کون سی غلطی ہوئی تھی مفسرین کے درمیان بحث ہے۔

مشہور ترین مفسر، ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ شیطان یا (کوئی شیطان صفت) ایک طبیب کی صورت میں ایوب علیہ السلام کی بیوی کے پاس آیا اس نے کہا: میں تیرے شوہر کا علاج کرتا ہوں صرف اس شرط پر کہ جس وقت وہ ٹھیک ہو جائے تو وہ مجھ سے یہ کہہ دے کہ صرف میں نے اسے شفا یاب کیا ہے، اس کے علاوہ میں اور کوئی اجرت نہیں چاہتا۔ ان کی بیوی نے جو ان کی مسلسل بیماری کی وجہ سے سخت پریشان تھی اس شرط کو قبول کر لیا اور حضرت ایوب علیہ السلام کے سامنے یہ تجویز پیش کی، حضرت ایوب علیہ السلام جو شیطان کے جال

---

[1] سورہ ص آیت 43

[2] سورہ ص آیت 44

کو سمجھتے تھے، بہت ناراض ہوئے اور قسم کھائی کہ وہ اپنی بیوی کو سزا دیں گے۔

بعض نے کہا ہے کہ جناب ایوب علیہ السلام نے اسے کسی کام کے لئے بھیجا تھا تو اس نے دیر کردی، حضرت ایوب علیہ السلام چونکہ بیماری سے تکلیف میں تھے، بہت پریشان ہوئے اور اس طرح کی قسم کھائی۔ بہرحال اگر وہ ایک طرف سے اس قسم کی سزا کی مستحق تھی تو دوسری طرف اس طویل بیماری میں اس کی وفاداری، خدمت اور تیمارداری اس قسم کے عفو و درگذر کا استحقاق بھی رکھتی تھی۔

یہ ٹھیک ہے کہ گندم کی شاخوں کے ایک دستہ یا خوشہ خرما کی لکڑیوں سے مارنا ان کی قسم کا واقعی مصداق نہیں تھا لیکن خدا کے نام کے احترام کی حفاظت اور قانون شکنی پھیلنے سے روکنے کے لئے انھوں نے یہ کام کیا اور یہ بات صرف اس صورت میں ہے کہ کوئی مستحق عفو و درگذر ہو، اور انسان چاہے کہ عفو و درگذر کے باجود قانون کے ظاہر کو بھی محفوظ رکھے ورنہ ایسے مواقع پر جہاں استحقاق عفو و بخشش نہ ہو وہاں ہرگز اس کام کی اجازت نہیں ہے۔ قرآن میں اس واقعہ کے آخری جملے میں جو اس داستان کی ابتداء و انتہا کا نچوڑ ہے، فرمایا گیا ہے: ''ہم نے اسے صابر و شکیبا پایا، ایوب کتنا اچھا بندہ تھا جو ہماری طرف بہت زیادہ رجوع کرنے والا تھا''۔ [1]

یہ بات کہے بغیر ہی ظاہر ہے کہ ان کا خدا کی بارگاہ میں دعا کرنا اور شیطان کو وسوسوں اور درد، تکلیف اور بیماری کے ودو ہونے کا تقاضا کرنا، مقام صبر و شکیبائی کے منافی نہیں اور وہ بھی سات سال اور ایک روایت کے مطابق اٹھارہ سال تک بیماری اور فقر و ناداری کے ساتھ نبھانے اور شاکر رہنے کے بعد۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس جملے میں حضرت ایوب علیہ السلام کی تین اہم صفات کے ساتھ توصیف کی گئی ہے کہ جو جس کسی میں بھی پائی جائیں وہ ایک انسان کامل ہوتا ہے۔

1۔ مقام عبودیت 2۔ صبر و استقامت

3۔ پے در پے خدا کی طرف بازگشت۔

حضرت ایوب علیہ السلام قرآن اور توریت میں

اس عظیم پیغمبر کا پاک چہرہ، جو صبر و شکیبائی کا مظہر ہے، یہاں تک کہ صبر ایوب علیہ السلام سب کے لئے ضرب المثل ہو گیا ہے، قرآن مجید میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ خدا نے کس طرح سے اس داستان کی ابتدا اور انتہا میں ان کی تعریف کی ہے۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس عظیم پیغمبر کی سرگزشت بھی جاہلوں یا دانا دشمنوں کی دستبرد سے محفوظ نہ رہی اور ایسے ایسے خرافات ان پر باندھے گئے جن سے ان کی مقدس و پاک شخصیت منزہ ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ بیماری کے وقت حضرت ایوب علیہ السلام کے بدن میں کیڑے پڑ گئے تھے اور ان میں بدبو پیدا ہو گئی تھی کہ بستی والوں نے انہیں آبادی سے باہر نکال دیا۔

بلا شک و شبہ اس قسم کی روایت جعلی اور من گھڑت ہے، چاہے وہ حدیث کی کتابوں کے اندر ہی کیوں نہ ذکر ہوئی ہوں، کیونکہ پیغمبروں کی رسالت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ ہر وقت اور ہر زمانے میں میل و رغبت کے ساتھ ان سے مل سکیں اور جو بات لوگوں کے تنفر و بے زاری اور افراد کے ان سے دور رہنے کا موجب بنے، چاہے وہ تنفر بیماریاں ہوں یا عیوب جسمانی یا اخلاقی خشونت و سختی، ان میں نہیں ہوں گی، کیونکہ یہ چیزیں ان کے فلسفہ رسالت سے تضاد رکھتی ہیں۔

لیکن توریت میں ایک مفصل قصہ ''ایوب'' کے بارے میں نظر آتا ہے جو ''مزامیر داود'' سے پہلے موجود ہے، یہ کتاب

---

[1] سورہ ص آیت 44

42 فصل پر مشتمل ہے اور ہر فصل میں تفصیلی بحث موجود ہے، بعض فصول میں تو انتہائی تکلیف دہ مطالب نظر آتے ہیں، ان میں سے تیسری فصل میں ہے کہ: ایوب علیہ السلام نے شکایت کے لئے زبان کھولی اور بہت زیادہ شکوہ کیا، جب کہ قرآن نے ان کی صبر وشکیبائی کی تعریف کی ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام

''یونس''''متی'' کے فرزند ہیں ''ذوالنون'' (مچھلی والا) آپ کا لقب ہے اور یہ لقب اس بنا پر ہے کہ چونکہ ان کی سر گذشت، جیسا کہ ہم بیان کریں گے، ایک مچھلی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، آپ ان مشہور پیغمبروں میں سے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے بعد اس دنیا میں آئے۔

بعض نے انہیں حضرت ہود علیہ السلام کی اولاد میں سے قرار دیا ہے اور ان کی ماموریت قوم ثمود کے باقی ماندہ لوگوں کی ہدایت قرار دیا ہے۔

ان کے ظہور کا مقام عراق کا ایک علاقہ ہے جس کا نام نینوا تھا۔

بعض نے ان کا ظہور 825 قبل مسیح لکھا ہے اور اب بھی کوفہ کے نزدیک شط فرات کے کنارے ''یونس'' کے نام کی معروف قبر موجود ہے۔

بعض کتابوں نے لکھا ہے کہ آپ بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر تھے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد اہل نینوا کی طرف مبعوث ہوئے۔[1]

یونس علیہ السلام امتحان کی بھٹی میں

یونس علیہ السلام نے بھی دیگر انبیاء کی طرح اپنی دعوت کی ابتداء توحید اور بت پرستی کے خلاف قیام سے شروع کی۔ اس کے بعد ان برائیوں کے خلاف نبرد آزمائی کی جو اس ماحول میں رائج تھے۔

لیکن وہ متعصب قوم، جو آنکھیں اور کان بند کر کے، اپنے بوڑھوں کی تقلید کر رہی تھی۔ ان کی دعوت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔

اس کے بعد کچھ اور واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں جو قرآن کے بیان سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ اسلامی روایت کے مطابق تو حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعوت دینے کے لئے قیام کیا اور اس سلسلے میں اپنے فریضے اور ذمہ داری کو انجام دیا اور جب انکی قوم نے ان کی دعوت کو رد کر دیا تو انھوں نے انہیں نفرین کی اور بد دعا دی پھر ان کے درمیان سے چلے گئے اور کشتی اور مچھلی کا واقعہ انہیں پیش آیا لیکن توریت کی عبارت بہت ناموزوں سی ہے اور تصریح کے ساتھ کہتی ہے کہ وہ انجام ذمہ داری سے پہلے ہی یہ چاہتے تھے کہ استعفی دے دیں۔ لہٰذا وہ بھاگ کھڑے ہوے اور کشتی اور مچھلی والا واقعہ پیش آیا۔

اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ ''توریت'' کہتی ہے: جب خدا نے اس قوم سے ان کی توبہ کی وجہ سے عذاب

---

[1] کتاب ''یوناہ'' میں جو عہد عتیق (توریت) کی کتابوں میں سے ہے۔ ''یونس'' کے بارے میں تفصیلی ذکر ''یوناہ بن متی'' کے نام سے کیا گیا ہے۔
اس کے مطابق وہ اس کے لئے مامور ہوئے تھے کہ عظیم شہر نینوا جائیں اور لوگوں کی شرارت کے خلاف قیام کریں،

اٹھالیا،تو یونس کو بہت دکھ ہوااور وہ بھڑک اٹھے۔

توریت کی فصول سے معلوم ہوتا ہے کہ یونس علیہ السلام کو دومرتبہ مامور کیا گیا پہلی ماموریت کے موقع پر انکار کر دیا اور اس دردناک انجام میں مبتلا ہوئے۔دوبارہ انہیں مامور کیا گیا کہ اسی شہر''نینوا'' کی طرف جائیں کہ نینوا کے لوگ بیدار ہو چکے ہیں اور خدا پر ایمان لے آئے ہیں اور انھوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کرلی ہے۔اور وہ عفو الٰہی ان کے شامل حال ہوگیا ہے۔لیکن عفو وبخشش یونس علیہ السلام کو اچھی نہیں لگی۔

قرآن اور اسلامی روایات کے بیانات کا موجودہ توریت کے بیانات سے موازنہ کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ''توریت''میں کتنی تحریف ہوگئی ہے کہ اس نے اس عظیم پیغمبر علیہ السلام کے مقام کو اس قدر گرادیا ہے کبھی ان کی طرف ماموریت اور ذمہ داری قبول نہ کرنے کی نسبت دیتی ہے اور کبھی ایک توبہ کرنے والی قوم پر پروردگار کے عفو ورحمت کو دیکھ کر خشم ناک ہونے کی نسبت دیتی ہے۔یہی چیزیں ہیں جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ موجودہ توریت کسی لحاظ سے بھی قابل اعتماد کتاب نہیں ہے بہرحال وہ ایک عظیم پیغمبر ہیں جن کو قرآن نے عظمت کے ساتھ یاد کیا ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام اسی طرح ایک مہربان باپ کے مانند دلسوزی اور خیرخواہی کے ساتھ اس گمراہ قوم کو وعظ ونصیحت کرتے رہے،لیکن اس حکیمانہ منطق کے مقابلے میں دشمنوں کے پاس مغالطہ اور ڈھٹائی کے سوا کوئی چیز نہ تھی۔

صرف ایک چھوٹا سا گروہ جو شاید دو افراد (ایک عابد اور ایک عالم) پر مشتمل تھا ان پر ایمان لایا۔

حضرت یونس علیہ السلام نے اس قدر تبلیغ کی کہ ان سے تقریباً مایوس ہوگئے۔بعض روایات میں آیا ہے کہ عابد کے کہنے پر (گمراہ قوم کی کیفیت اور حالات کو دیکھتے ہوئے) آپؑ نے پختہ ارادہ کرلیا کہ ان کے خلاف بددعا کریں۔

یہ پروگرام پورا ہوگیا اور حضرت یونس علیہ السلام نے ان پر نفرین کی اور انہیں بددعا دی۔جو آپؑ پر وحی آئی کہ فلاں وقت عذاب الٰہی نازل ہوگا۔جب عذاب کے وعدے کا وقت قریب آیا تو حضرت یونس علیہ السلام اس عابد کے ساتھ اس قوم کے درمیان سے باہر چلے گئے۔ایسی حالت میں کہ آپؑ نہایت غصے میں تھے یہاں تک کہ دریا کے کنارے پر پہنچ گئے وہاں لوگوں اور وزن سے بھری ایک کشتی دیکھی۔آپؑ نے ان سے خواہش کی کہ مجھے بھی اپنے ہمراہ لے چلیں۔

یونس علیہ السلام فراری بندہ

اسی واقعے کی طرف قرآن اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:''اس وقت کو یاد کرو جب اس نے وزن اور لوگوں سے بھری ہوئی کشتی کی طرف فرار کیا''۔[1]

قرآن میں''ابق''کا لفظ استعمال ہوا ہے۔''اباق''کے مادہ سے غلام کے اپنے آقا ومولا کے پاس سے بھاگ جانے کے معنی میں ہے اس مقام پر یہ ایک عجیب وغریب تعبیر ہے۔یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بہت ہی چھوٹا سا ترک اولیٰ کہ جو عالی مقام پیغمبروں سے سرزد ہوجائے،خدا کی طرف سے کس قدر سخت گیری اور عتاب کا باعث بنتا ہے،یہاں تک کہ وہ اپنے پیغمبر کو بھاگ جانے والے غلام کا نام دیتا ہے۔

بلاشک وشبہ یونس علیہ السلام معصوم پیغمبر تھے اور وہ کبھی بھی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے،لیکن پھر بھی بہتر یہی تھا کہ وہ تحمل سے کام

---

[1] سورہ صافات آیت 140

لیتے اور نزول عذاب سے قبل کے آخری لمحات تک اپنی قوم کے ساتھ رہتے کہ شاید وہ بیدار ہو جائے۔

یہ ٹھیک ہے کہ بعض روایات کے مطابق آپؑ نے چالیس سال تک تبلیغ کی تھی، لیکن پھر بھی بہتر یہی تھا کہ چند روز یا چند گھنٹے اور ٹھہر جاتے۔ آپؑ نے چونکہ ایسا نہیں کیا لہٰذا آپؑ کو بھاگ جانے والے غلام سے تشبیہ دی گئی ہے۔

قرعہ تین بار جناب یونس علیہ السلام کے نام

بہر حال یونس علیہ السلام کشتی پر سوار ہو گئے۔ روایات کے مطابق ایک بہت بڑی مچھلی نے کشتی کی راہ روک لی اور منہ کھول دیا گویا وہ کچھ کھانے کو مانگ رہی ہو۔ کشتی میں بیٹھنے والوں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گنہگار ہمارے درمیان ہے (کہ جسے اس مچھلی کا لقمہ بننا چاہئے اور قرعہ اندازی سے کام لینے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔) اس موقع پر انھوں نے قرعہ ڈالا تو قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام نکل آیا۔

ایک روایت کے مطابق انھوں نے تین مرتبہ قرعہ ڈالا اور ہر دفعہ حضرت یونس علیہ السلام ہی کا نام نکلا۔ ناچار انھوں نے یونس علیہ السلام کو پکڑ کر اس بہت بڑی مچھلی کے منہ میں پھینک دیا۔

یہ تفسیر بھی بیان کی جاتی ہے کہ دریا میں طوفان آ گیا تھا اور کشتی پر وزن بہت زیادہ تھا کشتی میں بیٹھنے والوں کو ہر لمحے غرق ہونے کا خطرہ ہونے لگا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ کشتی کو ہلکا کرنے کے لئے کچھ لوگوں کو دریا میں پھینک دیا جائے اور قرعہ یونس علیہ السلام کے نام نکل آیا۔ انھوں نے آپؑ کو دریا میں پھینک دیا اور ٹھیک اسی وقت ایک مگر مچھ وہاں آن پہنچا اور اس نے آپؑ کو نگل لیا۔

لیکن وہ خدا جو آگ کو پانی کے اندر اور شیشے کو پتھر کی آغوش میں محفوظ رکھتا ہے، اس نے اس عظیم جانور کو حکم تکوینی دیا کہ اس کے بندے یونس علیہ السلام کو معمولی سی تکلیف بھی نہ پہنچائے، حضرت یونس علیہ السلام کو ایک بے نظیر اور عجیب قید میں رہنا تھا، تاکہ وہ اپنے ترک اولیٰ کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی تلافی کریں۔ ایک روایت میں اس طرح آیا ہے: ''خدا نے اس مچھلی کی طرف وحی کی کہ اس کی کوئی ہڈی نہ توڑنا اور اس کے کسی جوڑ کو نہ کاٹنا''۔

جناب یونس علیہ السلام نے استغفار کیا

یونس علیہ السلام بہت جلد ہی اصل قضیے کی طرف متوجہ ہو گئے، آپ نے پوری توجہ کے ساتھ بارگاہ خداوندی کی طرف رخ کیا اور اپنے ترک اولیٰ پر استغفار کی اور اس کی مقدس اور معروف بارگاہ سے عفو و کا تقاضا کیا۔[1]

میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور تیری بارگاہ سے دور ہو گیا ہوں اور تیرے عتاب و سرزنش میں، جو میرے لئے جہنم سوزان کے مانند ہے، گرفتار ہو گیا ہوں۔

یہاں ظلمات کے کیا معنی ہیں؟ ممکن ہے کہ یہ تعبیر دریا اور پانی کی گہرائیوں کی تاریکی اور اس بہت بڑی مچھلی کے پیٹ کی تاریکی اور رات کی تاریکی کی طرف اشارہ ہو، اور ایک روایت کہ جو امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، وہ بھی اس کی تائید کرتی ہے۔

اس مخلصانہ اعتراف اور ندامت سے ملی ہوئی تسبیح نے اپنا کام کیا اور جیسا کہ قرآن میں بیان ہوا ہے: اس نے تہہ بہ تہہ تاریکیوں میں پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تو پاک و منزہ ہے میں ہی ظالموں میں سے تھا۔ ''ہم نے اس کی دعا قبول کر لی اور

---

[1] اس مقام پر ایک نہایت پر معانی اور معروف ذکر حضرت یونس علیہ السلام کی زبانی نقل ہوا ہے جو سورہ انبیاء کی آیہ 87 میں آیا ہے اور اہل عرفان کے درمیان ذکر ''یونسیہ'' کے نام سے مشہور ہے: ''فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝''

اسے غم واندوہ سے نجات دی اور ہم ایمان والوں کو اسی طرح سے نجات دیا کرتے ہیں''۔[1]

اب دیکھیں قرآن اس سلسلے میں کیا کہتا ہے، ارشاد پروردگار ہوا: ''اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا، تو یقیناً وہ قیامت کے دن تک مچھلی کے پیٹ میں ہی رہتا''۔[2]

اور یہ وقتی قید خانہ دائمی زنداں میں بدل جاتا اور وہ دائمی زنداں اس کے لئے قبرستان میں بدل جاتا۔ وہ بہت بڑی مچھلی خشک و بے گیاہ ساحل کے نزدیک آئی اور حکم خدا سے اس لقمے کو جو اس سے زائد تھا باہر پھینک دیا۔

لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس عجیب وغریب زندان نے یونس علیہ السلام کے جسم کی سلامتی کو درہم وبرہم کر دیا تھا، لہٰذا وہ بیمار و ناتواں اس زنداں سے آزاد ہوئے۔

ہمیں صحیح طور پر معلوم نہیں ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کتنی مدت تک مچھلی کے پیٹ میں رہے، لیکن یقینی طور پر جتنا عرصہ بھی رہے اس کے عوارض سے بچ نہیں سکتے تھے، یہ ٹھیک ہے کہ فرمان الٰہی صادر ہوا تھا کہ مچھلی کے بدن میں ہضم اور جذب نہ ہوں، لیکن یہ اس معنی میں نہیں تھا کہ اس زندان کے کچھ آثار بھی وہ اپنے ساتھ نہ لائیں لہٰذا مفسرین کی ایک جماعت نے لکھا ہے کہ وہ ایک نو مولود، ضعیف و ناتوان اور بے پر وبال، پرندے کے بچے کی طرح مچھلی کے پیٹ سے باہر آئے، اس طرح سے کہ ان میں حرکت کرنے کی بھی طاقت نہیں تھی۔

جناب یونس علیہ السلام کدو کی بیل کے سایہ میں

پھر لطف الٰہی ان کے شامل حال ہوا، کیونکہ ان کا بدن بیمار اور خستہ حال اور ان کا جسم کمزور و ناتواں تھا، ساحل کی دھوپ انہیں تکلیف پہنچاتی تھی، لہٰذا ان کے لئے ایک نرم وگداز اور لطیف قسم کے لباس کی ضرورت تھی تا کہ ان کے بدن کو اس کے نیچے آرام حاصل ہو، اس مقام پر قرآن کہتا ہے: ہم نے ایک کدو کی بیل اس کے اوپر اگا دی'' (1) تا کہ وہ اس کے چوڑے اور مرطوب پتوں کے نیچے ارام کرے۔

کہتے ہیں کہ کدو کی بیل میں اس کے علاوہ کہ اس کے پتے چوڑے اور پانی سے پر ہوتے ہیں اور اس سے اچھا سائبان بنایا جاسکتا ہے، مکھی بھی اس کے پتوں پر نہیں بیٹھتی۔

اور یونس علیہ السلام کے بدن کی جلد مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے اس قدر نازک اور حساس ہوگئی تھی کہ اس پر حشرات کے بیٹھنے سے بھی تکلیف ہوتی تھی،

انھوں نے اپنے بدن کو اس کدو کی بیل کے ساتھ چھپا لیا تا کہ سورج کی تپش سے بھی مامون رہیں اور حشرات الارض سے بھی۔

شاید خدا کو یہ مطلوب ہے کہ وہ سبق جو حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں دیا تھا اس کی اس مرحلہ میں تکمیل کرے، وہ سورج کی تپش اور اس کی حرارت کو اپنے بدن کی نازک جلد پر محسوس کریں،

تا کہ آئندہ رہبر ہوتے ہوئے اپنی امت کو جہنم کی جلانے والی آگ سے نجات کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔

---

[1] سورہ انبیاء آیت 88

[2] سورہ صافات آیت 143-144